بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ وَعَلٰی عَبۡدِہِ الۡمَسِیۡحِ الۡمَوۡعُوۡد

افراد جماعت احمدیہ قادیان

اور دیگر معزز قارئین کرام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاۃ

جماعت احمدیہ قادیان میں سچ بولنے اور حق کیلئے آواز اُٹھانے کے جرم میں احمدیوں کیساتھ کیا کیا سلوک روا رکھا جاتا ہے؟؟اس حقیقت سے آگاہ ہونے کیلئے آپ ایک سابقہ قادیانی مربی جناب محمد نذیر صاحب کی دِل دہلا دینے والی کہانی سماعت فرمائیں۔سابقہ مربی محمد نذیر صاحب نے اپنے نٹرویو میں جن باتوں کا ذکر کیا ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ وہ سب سچ نہیں ہیں۔مثلاً۔پہلے ہی صفحہ پر مربی صاحب کہتے ہیں۔

(۱)''تذکرہ''مرزا غلام احمد قادیانی کے الہامات اور''وحی''(نعوذ باللہ) پر مشتمل کتاب ہے،جو قادیانیوں کے نزدیک قرآن مجید کے برابر بلکہ اس سے بھی افضل کتاب خیال کی جاتی ہے۔''تذکرہ''پڑھاتے ہوئے ہمارے استاد ہمیں بتایا کرتے کہ اگر قرآن مجید کے ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں تو''تذکرہ''کے ایک حرف پر سو نیکیاں ملتی ہیں۔''(صفحہ۔۱)

(۲)صفحہ۔۳ پر مربی صاحب کہتے ہیں۔۔۔''اب مربی کا کام آسان ہوجاتا ہے کیونکہ زمین ہموار ہوجاتی ہے۔پھر وہ پہلے مرزا غلام احمد قادیانی کو''ٹارگٹ''کے سامنے ایک ولی،بزرگ اور مجدد کے رُوپ میں پیش کرتا ہے۔پھر ظلی بروزی نبی کے طور پر متعارف کراتا ہے اور آخر میں اپنے''ٹارگٹ''کو اس بات پر لے آتا ہے کہ آخری نبی تو بس''مرزا صاحب''ہی ہیں(نعوذ باللہ)۔یہ مربی کا مخصوص طریقہ واردات ہوتا ہے۔''(صفحہ۔۳)

ہم قارئین سے کہنا چاہتے ہیں کہ یہ بات تو بالکل درست ہے کہ قادیانی خلفاء اور علماء ختم نبوت کی طرح ختم مجددیت کا عقیدہ اپنا چکے ہیں لیکن مذکورہ بالا دونوں باتیں بالکل بے بنیاد اور جھوٹ ہیں۔حضرت مرزا صاحبؑ کا کوئی بھی پیروکار خواہ اُس کا کسی بھی گروپ سے تعلق ہو۔نہ وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ قرآن مجید کے بالمقابل تذکرہ پڑھنے سے دس گناہ زیادہ نیکیاں ملتی ہیں اور نہ ہی وہ حضرت مرزا صاحبؑ کو آخری نبی سمجھتا ہے۔یہ سب بے بنیاد اور غلط باتیں یا تو مربی صاحب نے جھوٹے طور پر انتقاماً کہی ہیں اور یا پھر انٹرویو لینے والا اپنی طرف سے مربی صاحب کے منہ میں یہ باتیں جھوٹے طور پر ڈال رہا ہے۔بہرحال حقیقت کو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ہم نے اس نیوز نمبر ۱۰۲ میں جماعتی نظام کی عمومی تصویر دکھائی ہے۔اور یہ دکھایا ہے کہ جو کوئی احمدی جماعتی قیادت سے کسی رنگ میں بھی اختلاف کرتا ہے تو پھر نظام جماعت اُس کیساتھ کس طرح کا ظالمانہ سلوک کرتا ہے۔اس انٹرویو کے ہمارے ویب سائٹ پر آن آیئر ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اس انٹرویو کے مندرجات سے سو فیصد متفق ہیں۔ایسا ہرگز نہیں ہے۔وہ قادیانی حضرات جو خلافت کی برکتوں اور اپنی نام نہاد خلافت کے گیت گاتے نہیں تھکتے اُنہیں چاہیے کہ وہ اپنے جماعتی عہدیداروں کی اخلاقی بے راہ روی اور اُنکے کرتوتوں سے آگاہ ہونے کیلئے اس مظلوم قادیانی مربی کی عبرت ناک داستان کو ضرور بغور وفکر پڑھیں۔والسلام ویب ماسٹر

الغلام ڈاٹ کم(www.alghulam.com)

مورخہ ۱۰ر دسمبر ۲۰۱۴ء

چلتے ہیں دبے پاؤں کوئی جاگ نہ جائے غلامی کے اَسیروں کی یہی خاص اَدا ہے

ہوتی نہیں جو قوم حق بات پہ یکجا اس قوم کا حاکم ہی فقط اِس کی سزا ہے

☆☆☆☆☆☆

اسلام قبول کرنے پر قادیانی رہنما ظلم کا نشانہ بنتے رہے

پیدا ہوتے ہی مجھے مستقبل کا ”مربی“ چُن لیا گیا تھا۔ والد 22 سال جماعت احمدیہ جھنگ کے صدر رہے۔ مسلمان علما کو قادیانی اساتذہ جادوگر کہتے تھے۔ مسجد جانے پر ڈنڈوں سے پیٹا۔ ”مبلغ“ کیلئے ہومیوپیتھک ڈاکٹر ہونا لازمی ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام کے قریبی عزیز کی کہانی انہی کی زبانی

محمد نذیر سابق قادیانی مربی ہیں۔ وہ جھنگ کے ایک معروف قادیانی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ قادیانی سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام سے ان کی قریبی رشتہ داری ہے۔ انہوں نے جامعہ احمدیہ، چناب نگر میں پانچ سالہ خصوصی کورس کرنے کے بعد بطور مربی دس سال تک پنجاب اور سندھ میں قادیانیت کا پرچار کا۔ 2005ء میں انہوں نے قادیانی جماعت سے کنارہ کشی اختیار کی تو انہیں ”راہ راست“ پر لانے کیلئے مختلف حربے استعمال کئے گئے۔ لیکن ان پر ڈھائے جانے والے مظالم انہیں اپنے موقف پر مزید پختہ کرتے رہے اور نور ایمان ان کے دل میں گھر کرتا چلا گیا۔ 26 فروری 2014ء کو انہوں نے ایوان اقبال لاہور میں منعقدہ ”فتح مباہلہ کانفرنس“ کے موقع پر اردن کے ایک اسلامی سکالر کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ محمد نذیر کا ظلمت سے نور تک کا یہ سفر ایمان افروز بھی ہے اور دل گداز بھی۔ ان کی داستان حیات نذر قارئین ہے۔

”میرا نام محمد نذیر ہے۔ میں 1973ء میں جھنگ کے ایک قادیانی گھرانے میں پیدا ہوا۔ والد غلام حسین جماعت احمدیہ جھنگ کے سرکردہ ارکان میں سے تھے۔ انہوں نے پچاس کی دہائی کے اوائل میں قادیانیت اختیار کی تھی۔ وہ 22 سال تک جماعت احمدیہ جھنگ کے صدر بھی رہے۔ والدہ 6 سال تک قادیانی خواتین کی تنظیم ”لجنہ اماء اللہ“ کی ضلعی صدر رہیں۔ بڑے بھائی محمد رفیع 6 سال تک انجمن خدام الاحمدیہ جھنگ کے صدر رہے۔ معروف قادیانی سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام ہمارے قریبی عزیز تھے۔ میری شادی بھی انہی کی فیملی میں ہوئی۔ میری سابقہ قادیانی بیوی ان کی بھانجی ہے۔ والد نے میری پیدائش کے وقت ہی مجھے قادیانیت کی خدمت کے لئے وقف کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ لہٰذا مجھے مربی (مبلغ) ہی بننا تھا۔ جب ہوش سنبھالا تو گورنمنٹ پرائمری اسکول برانچ نمبر 2 جھنگ میں داخل کرا دیا گیا۔ وہاں دو قادیانی اساتذہ، ماسٹر دوست محمد اور ماسٹر ولی محمد قادیانی بچوں پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے مجھے پڑھانے کے ساتھ ساتھ میری ”مذہبی“ تربیت بھی شروع کر دی۔ ایک روز ایسا ہوا کہ اسکول کے اوقات میں ظہر کی نماز کے وقت اپنے کچھ ہم جماعت مسلمان دوستوں کی دیکھا دیکھی میں بھی نماز پڑھنے مسجد چلا گیا۔ واپسی پر ان دونوں ٹیچرز نے مجھے زمین پر لٹا کر ڈنڈوں سے خوب پٹائی کی۔ مجھے اس پر سخت حیرت ہوئی کہ یہ لوگ نماز پڑھنے پر مجھے کیوں مار رہے ہیں۔ بعد میں انہوں نے مجھے سمجھایا کہ ”جن لڑکوں کے ساتھ تم نماز پڑھنے گئے تھے، وہ کافر ہیں اور ہم مسلمان ہیں۔ آئندہ ان کی مسجد میں بالکل نہیں جانا“۔ یہ میری تربیت کا پہلا ”سبق“ تھا۔ انہوں نے مجھے دوسرا سبق یہ دیا کہ مسلمان علما کے قریب بھی نہیں پھٹکنا۔ وہ علمائے کرام کو جادوگر کہتے اور ان سے میل جول اور بات چیت سے سختی سے منع کرتے تھے۔ 1992ء میں اسلامیہ ہائی اسکول جھنگ سے میٹرک کرنے کے بعد اپریل 1992ء میں مربی کے خصوصی کورس کے لئے جامعہ احمدیہ چناب نگر میں داخل ہوا۔ جامعہ احمدیہ میں قادیانیت کے ”مذہبی اسکالر“ تیار کرنے کے لئے دو کورس کرائے جاتے ہیں، جن میں پانچ سالہ کورس ”مبشر“ اور سات سالہ کورس ”شاہد“ کہلاتا ہے۔ ان میں فرق یہ ہے کہ ”شاہد“ کورس کرنے والا اپنے ”فن“ کا اسپیشلسٹ ہوتا ہے۔ یہ کورس کرنے والوں کو تخصص کرایا جاتا ہے۔ میرا داخلہ ”مبشر“ کورس کے لئے ہوا تھا۔ کورس کرنے والے طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام جامعہ کے اندر ہی تھا۔ اُس دور میں جامعہ کے ہر طالب علم کو 1700 روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ ہر طالب علم کے تمام اخراجات قادیانی جماعت برداشت کرتی تھی۔ میری معلومات کے مطابق، جامعہ احمدیہ میں مربی کا کورس کرنے والے ایک طالب علم پر 20 ہزار روپے ماہانہ خرچ ہوتے ہیں۔ اگر پانچ سال کا حساب کیا جائے تو ایک مربی تیار کرنے پر قادیانی جماعت، بارہ لاکھ روپے خرچ کرتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر طالب علم سے اس کو ملنے والے وظیفے میں سے 16 فیصد بطور چندہ، جماعت ضرور وصول کرتی تھی۔ ہماری کلاس کا آغاز صبح چھ بجے ہوتا اور دوپہر ایک بجے چھٹی ہوتی تھی۔ پہلے سال نورانی قاعدہ یسرنا القرآن سے ہماری پڑھائی کا آغاز ہوا اور ساتھ ساتھ ”سیرت مسیح موعود“ بھی پڑھائی جانے لگی۔ اس کے علاوہ دیگر عصری علوم بھی سبق میں شامل تھے۔ اگلے سال وفات مسیح سے متعلق قرآن مجید کی قریباً 30 آیات کا ترجمہ اور قادیانی جماعت کی تفسیر کے علاوہ ”تذکرہ“ کو بھی سبق میں شامل کر دیا گیا۔ ”تذکرہ“ مرزا غلام احمد قادیانی کے الہامات اور ”وحی“ (نعوذ باللہ) پر مشتمل کتاب ہے، جو قادیانیوں کے نزدیک قرآن مجید کے برابر بلکہ اس سے بھی افضل کتاب خیال کی جاتی ہے۔ ”تذکرہ“ پڑھاتے ہوئے ہمارے استاد ہمیں بتایا کرتے کہ اگر قرآن مجید کے ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں تو ”تذکرہ“ کے ایک حرف پر سو نیکیاں ملتی ہیں۔ تیسرے سال جماعت احمدیہ کی مخصوص کتب پڑھانے کے علاوہ ہمیں نمازوں کے اوقات میں چناب نگر کی قادیانی عبادت گاہوں میں نماز کی امامت کے لئے بھی بھیجا جانے لگا۔ جماعت نے اپنی مرضی کی کچھ احادیث کو توڑ مروڑ کر ”صدیقۃ الصالحین“ کے نام سے ایک مجموعہ احادیث بھی تیار کر رکھا ہے۔ یہ کتاب اکثر قادیانیوں کے گھروں میں موجود ہوتی ہے۔ ہمارے نصاب میں بھی یہ کتاب شامل تھی۔ ابھی جامعہ احمدیہ میں داخل ہوئے دو ماہ ہی ہوئے تھے کہ وہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اسلام آباد کا رہائشی سعید نامی لڑکا میرا ہم جماعت تھا۔ سعید اور نفیس دونوں کزن تھے اور وہاں مربی کا کورس کرنے آئے تھے۔ سعید بے حد خوبصورت، گورا چٹا اور بھولا بھالا سا تھا۔ ایک روز کلاس ختم ہونے کے بعد جب ہم ہاسٹل واپس آئے تو سعید نے اپنا بستر اور دیگر سامان باندھنا شروع کر دیا۔ ہم نے وجہ پوچھی تو اس کی آنکھیں بھر آئیں، لیکن وہ کچھ بتانے کو تیار نہ ہوا۔ بس خاموشی سے اپنا سامان سمیٹتا رہا۔ جب ہم نے اصرار کیا تو اس نے بتایا کہ جامعہ احمدیہ کے پرنسپل نے اس کے ساتھ بدفعلی کی ہے۔ لہٰذا اب وہ یہاں ایک پل بھی رکنے کو تیار نہیں۔ سعید کی اس بات پر ہمیں شدید غصہ آیا۔ کیونکہ ہمارے پرنسپل تو ”مرزا صاحب“ (غلام احمد قادیانی) کی فیملی کے قریبی عزیزوں میں سے تھے۔ ہمیں تو وہ چلتا پھرتا فرشتہ دکھائی دیتے تھے۔ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پرنسپل ایسی گھٹیا حرکت بھی کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کئی روز تک سعید کو گالیاں دیتے رہے۔ سعید کے والد غالباً فوجی افسر تھے۔ جب یہ معاملہ جماعت کے مرکزی ذمہ داروں تک پہنچا تو انہوں نے سعید کے والد کو بلوا لیا۔ سعید کے والد نے اسے جامعہ میں ہی رکنے پر زور دیا۔ لیکن اس نے اپنے والد سے کہا کہ وہ اسے گولی مار دیں یا گھر سے نکال دیں، لیکن وہ اب جامعہ میں پڑھے گا، نہ یہاں رہے گا۔ بالآخر وہ واپس اپنے گھر چلا گیا۔ جبکہ اس کے کزن نفیس نے کورس مکمل کیا اور وہ اب بھی قادیانی مربی کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ مربی کی تربیت کے دوران چند باتوں پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ ہر مربی کے لئے انگریزی زبان پر مکمل عبور حاصل کرنا ضروری ہے، کیونکہ اسے کسی بھی وقت کسی بھی ملک میں قادیانیت کے پرچار کے لئے بھیجا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے ہمیں آکسفورڈ کی کتابیں پڑھائی جاتیں، جس کے لئے ماہر اساتذہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ دوران تعلیم کھیلوں میں حصہ لینا لازمی تھا۔ ہر مربی کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی کھیل کا بہترین کھلاڑی بھی ہو۔ جامعہ احمدیہ میں کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، والی بال، بیڈمنٹن اور کبڈی کھیلنے کا مکمل انتظام موجود تھا اور ہر طالب علم کو کسی نہ کسی کھیل میں ضرور حصہ لینا پڑتا۔ طالب علم کے لئے دوران تعلیم ڈرائیونگ سیکھنا بھی ضروری ہے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس پانچ سالہ کورس کے دوران ہر طالب علم کو ہومیوپیتھی لازمی پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے لئے بھی ماہر اساتذہ کا انتظام جامعہ احمدیہ میں موجود ہے۔ ہر طالب علم کو مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک قابل ہومیوپیتھک ڈاکٹر بھی بنایا جاتا ہے۔ کیونکہ عملی میدان میں قادیانیت کے پرچار کے لئے لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

ummat.com.pk

ہفتہ/04 اکتوبر 2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

دوسری قسط

منصور اصغر راجہ

”قادیانی مربی کا پہلا ٹارگٹ مفلوک الحال مسلمان ہوتے ہیں“

مالی معاونت کرکے برین واشنگ کی جاتی ہے۔ 1998ء کی مردم شماری میں تھرپارکر میں جعلسازی کے ذریعے مسلمانوں کی کثیر آبادی کو قادیانی ظاہر کیا۔ اعلیٰ کارکردگی پر جماعت کی طرف سے مجھے لینڈ کروزر دی گئی۔ تائب ہونے والے قادیانی مربی کی کہانی انہی کی زبانی

قادیانیت سے تائب ہونے والے سابق مربی محمد نذیر نے بتایا..... ”جامعہ احمدیہ سے فراغت کے بعد 1996ء میں میری پہلی تعیناتی ضلع حافظ آباد کے موضع پیرکوٹ ثانی میں ہوئی۔ اس گاؤں میں قادیانی اکثریت میں ہیں اور ہر لحاظ سے طاقتور بھی ہیں۔ قادیانیوں کے نزدیک اس گاؤں کو بڑی مقدس حیثیت حاصل ہے کیونکہ یہاں مرزا غلام احمد قادیانی کے تین مصاحبین کی قبریں بھی ہیں۔ اس گاؤں میں میری تعیناتی ایک طرح کی ہاؤس جاب تھی۔ یہاں سے ٹریننگ لینے کے بعد مجھے ضلع منڈی بہاء الدین کے دیہات ”رجوعہ“ اور ”مرالہ کھناں والی“ بھیج دیا گیا۔ چند ماہ وہاں گزارنے کے بعد میری پوسٹنگ ضلع گجرات کے علاقوں ”ڈنگہ“ اور ”کنجاہ“ میں ہوگئی۔ میں ایک سال تک ان چار اسٹیشنز پر کام کرتا رہا اور اس عرصے میں یہاں کے 16 مسلمانوں کو میں نے قادیانی بنایا۔ پہلے ہی سال اس حیران کن کارکردگی کی وجہ سے میں جماعتی قیادت کی نظروں میں بھی آگیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے ملنے والی مراعات اور پروٹوکول میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ یہ جماعت کا اصول ہے کہ جو مربی جتنے زیادہ مسلمانوں کو قادیانی بنائے، اسے اتنی ہی زیادہ ترقی دی جاتی ہے۔ ویسے عام طور پر بھی مربی کو ماہانہ تنخواہ کے علاوہ کافی مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ میں جب 1996ء میں فیلڈ میں آیا، اُس وقت ایک مربی کی ماہانہ تنخواہ 10 ہزار روپے تھی۔ میڈیکل اور بچوں کی تعلیم فری تھی۔ اگر ملک میں علاج ممکن نہ ہوتا تو جماعت اپنے خرچے پر بیرون ملک علاج کے لئے بھجواتی۔ جس علاقے میں تعیناتی ہوتی، وہاں ایک وی آئی پی گھر ملتا۔ موسم کی مناسبت سے ہر سال نیا بستر دیا جاتا۔ کھانا الاؤنس الگ تھا۔ چناب نگر آنے جانے کا ٹی اے ڈی اے دیا جاتا۔ گرمیوں اور سردیوں میں قیمتی کپڑوں کے تین تین جوڑے بنوا کر دیے جاتے۔ ابتداء میں سائیکل دی جاتی، جس کی دیکھ بھال کے لئے ماہانہ 200 روپے الگ ملتے تھے۔ بہترین کارکردگی دکھانے پر اگلے مرحلے میں نئی لینڈ کروزر دی جاتی۔ البتہ مربی کے لئے موٹر سائیکل چلانے پر سخت پابندی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شروع شروع میں مربی کو سائیکل کے بعد موٹر سائیکل ہی دی جاتی تھی لیکن پھر مختلف علاقوں میں چند مربی موٹر سائیکل چلاتے ہوئے ایکسیڈنٹ ہونے سے مارے گئے۔ ان حادثات کے بعد جماعت کے مرکزی ذمہ داران سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور پھر یہ فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ جماعت کے پاس پہلے ہی مربی قلیل تعداد میں ہیں لہٰذا ان حادثاتی اموات سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ آئندہ کوئی مربی موٹر سائیکل نہیں چلائے گا۔ اس کے ساتھ ہی مربیوں کو موٹر سائیکل کی فراہمی بند کردی گئی“۔

”.....مربی کا براہ راست ناظر امور عامہ سے رابطہ ہوتا ہے۔ جماعت احمدیہ کے دو طاقتور ترین ذیلی انتظامی ادارے ناظر امور عامہ اور دفتر عمومی ہیں۔ دفتر عمومی صرف چناب نگر میں قادیانیوں کے معاملات کو ڈیل کرتا ہے اور ناظر امور عامہ پورے ملک کے قادیانیوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ مسلمانوں کو قادیانیت کی طرف مائل کرنے کے لئے ہر مربی دو بنیادی ہتھیاروں خوش اخلاقی اور چرب زبانی سے تو لیس ہوتا ہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی دوران تعلیم مسلمانوں کو پھانسنے کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ مربی کا پہلا ٹارگٹ انتہائی غریب مسلمان ہوتے ہیں۔ وہ ان کی کمزور مالی حالت اور معاشی مجبوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے قریب ہوتا ہے۔ مربی کی سفارش پر جماعت ”ٹارگٹ“ کی مالی معاونت کے لئے فنڈ جاری کرتی ہے۔ اس کے لئے کوئی لگی بندھی رقم نہیں ہوتی بلکہ لامحدود فنڈ ہوتا ہے۔ ”ٹارگٹ“ کی مالی حالت کے پیش نظر مربی جتنی رقم چاہے، جاری کرا سکتا ہے۔ مربی کی سفارش کو جماعت شاذ و نادر ہی رد کرتی ہے۔ مالی معاونت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ”ٹارگٹ“ کی برین واشنگ بھی شروع کردیتا ہے، جس کا نتیجہ اکثر کامیابی کی صورت میں نکلتا ہے۔ ایک مربی کے لئے لازم ہوتا ہے کہ وہ ایک وقت میں کم از کم 10 مسلمانوں کو قادیانیت کا پرچار کرے۔ مربی کا دوسرا بڑا ٹارگٹ وہ کھاتے پیتے امیر مسلمان ہوتے ہیں جو دین سے دور ہوں۔ ان میں سے بھی خاص طور پر وہ لوگ مربی کے لئے انتہائی آسان ہدف ثابت ہوتے ہیں جو علمائے کرام سے الرجک رہتے ہوں اور ان سے میل ملاقات اور ان کی مجالس میں بیٹھنا پسند نہ کرتے ہوں۔ ایسے لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے کے بعد مربی انہیں اپنی عبادت گاہ ”بیت الذکر“ آنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ والا ”ٹارگٹ“ جب قادیانی عبادت گاہ میں داخل ہوتا ہے تو مربی اس پر پہلا حملہ یہ کرتا ہے کہ اسے نماز پڑھ کر دکھاتا ہے اور نماز کے بعد دعا نہیں مانگتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ سوال اٹھا دیتا ہے کہ ہم نماز کے بعد دعا اس لئے نہیں مانگتے کہ نماز بذات خود دعا ہے۔ بعد میں دعا مانگنے کا کوئی جواز نہیں۔ اپنے دعوے کے حق میں مربی چند آیات بھی پیش کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ بڑے غیر محسوس انداز میں اپنے ”ٹارگٹ“ کو یہ باور کراتا ہے کہ جو لوگ (یعنی مسلمان) نماز کے بعد دعا مانگتے ہیں وہ غلط ہیں اور ہم صحیح ہیں۔ ”ٹارگٹ“ پر اگلا حملہ کرنے کے لئے مربی کسی قادیانی بچے کو بلا کر اس سے پہلا کلمہ سنواتا ہے۔ جب ”ٹارگٹ“ یہ دیکھتا ہے کہ ایک قادیانی بچہ بھی وہی کلمہ پڑھ رہا ہے جو ایک مسلمان بچہ پڑھتا ہے تو وہ تذبذب کا شکار ہوجاتا ہے اور مولوی کو کوستے ہوئے اسے مسلمانوں کو فرقوں میں تقسیم کرنے کا الزام دینے لگتا ہے۔ اب مربی کا کام آسان ہوجاتا ہے کیونکہ زمین ہموار ہوجاتی ہے۔ پھر وہ پہلے مرزا غلام احمد قادیانی کو ”ٹارگٹ“ کے سامنے ایک ولی، بزرگ اور مجدد کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ پھر ظلی بزوری نبی کے طور پر متعارف کراتا ہے اور آخر میں اپنے ”ٹارگٹ“ کو اس بات پر لے آتا ہے کہ آخری نبی تو بس ”مرزا صاحب“ ہی ہیں (نعوذ باللہ)۔ یہ مربی کا مخصوص طریقہ واردات ہوتا ہے۔“

”میں نے پنجاب میں ڈیوٹی کے دوران حافظ آباد، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، گجرات، منڈی بہاء الدین، فیصل آباد اور بہاولنگر میں کام کیا۔ بہاولنگر کی تحصیل فورٹ عباس کے چک نمبر 223 نائن آر میں تعیناتی کے دوران مجھے صحیح اندازہ ہوا کہ جامعہ احمدیہ میں دوران تعلیم کھیلوں میں حصہ لینا کیوں لازمی ہے اور اس کی کیا افادیت ہے۔ میں دور طالب علمی میں بطور بلے باز کرکٹ کا ایک اچھا کھلاڑی رہا ہوں۔ بعد میں بھی پریکٹس جاری رکھی۔ اس گاؤں میں بھی قادیانی بہت طاقتور اور اکثریت میں تھے۔ میں بھی شام کے وقت مقامی لڑکوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتا۔ اسی دوران ایک میچ میں ایک مسلمان بالر لڑکے کو میں نے چار گیندوں پر لگاتار چار چھکے مارے۔ اس شاندار بیٹنگ نے مقامی مسلمان لڑکوں کو میرا گرویدہ بنا دیا۔ اب وہ میرے ساتھ کھل کر اٹھنے بیٹھنے لگے۔ جب تعلق بڑھا تو وہ مجھے اپنی ٹیم کی طرف سے دوسری ٹیموں کے ساتھ کھیلنے کی دعوت دینے لگے۔ وہ جب بھی کھیلنے کی دعوت دیتے تو میں جواباً ان کے سامنے کبھی بیت الذکر آنے، کبھی ساتھ مل کر نماز پڑھنے اور کبھی میرا خطبہ سننے کی شرط رکھ دیتا۔ بس اس کھیل ہی کھیل میں، میں نے گیارہ ماہ میں اس گاؤں کے 12 مسلمان لڑکے قادیانی بنا دیئے۔“

”.....جماعت کی طرف سے مربی کو مسلمان علما کے ساتھ بحث مباحثے اور مناظرے سے سختی سے منع کیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں قادیانی اکثریت میں ہوں، وہاں وہ مسلمانوں کا ناطقہ بند کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیتے۔ میں وزیر آباد کے قریب قادیانیوں کے اکثریتی گاؤں ”کھیوے والی“ میں تعینات تھا۔ وہاں میں نے ایک مسلمان کو قادیانیت کی دعوت دی تو اس نے مجھے مناظرے کا چیلنج کردیا۔ میں نے بھی جوش میں آکر چیلنج قبول کرلیا۔ ان لوگوں نے اگلے روز سرگودھا کے مشہور عالم مولانا اکرم طوفانی کو بلا لیا۔ جماعت کو خبر ہوئی تو مجھے مناظرہ کرنے سے سختی سے روک دیا گیا۔ مولانا اکرم طوفانی آئے، انہوں نے ردِ قادیانیت پر بڑی سخت تقریر کی اور ساتھ ہی میرا نام لے کر مجھے بھی خوب لتاڑا۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ گاؤں کے اردگرد ساری اراضی قادیانی زمینداروں کی ملکیت تھی۔ مسلمانوں کو اس میں سے گزر کر اپنے رقبے پر جانا پڑتا تھا۔ میں نے انہیں سبق سکھانے کے لئے قادیانی زمینداروں کی میٹنگ بلالی۔ باہم مشورے سے حکمت عملی طے کی اور اگلے روز اس پر عملدرآمد شروع کردیا۔ قادیانی لڑکے ڈنڈے لے کر اپنی زمینوں پر کھڑے ہوگئے۔ جو بھی مسلمان وہاں سے گزرتا وہ اس کی پٹائی کرتے۔ مجبوراً مسلمانوں کو قادیانیوں سے معافی مانگنی پڑی“۔

”.....اسی دوران 1998ء کی مردم شماری شروع ہوگئی۔ جماعت احمدیہ کے ذمہ داران سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ کس طرح قادیانیوں کی آبادی زیادہ شو کی جائے۔ بالآخر باہمی مشورے سے ایک منصوبہ طے پایا اور مربیوں کے ذریعے اس پر عملدرآمد شروع کردیا گیا۔ اس سلسلے میں میری ڈیوٹی اندرون سندھ ضلع تھرپارکر میں لگائی گئی۔ میں نے وہاں مردم شماری ڈیوٹی کرنے والے مقامی ٹیچرز سے رابطہ کیا۔ ان کے ساتھ معاملات طے ہوئے اور پھر میں نے انہیں کچی پنسلیں خرید کردیں۔ وہ سارا دن ان پنسلوں سے مردم شماری فارم پُر کرتے۔ شام کو ساری فائلیں اٹھا کر میری قیام گاہ پر لے آتے اور میرے سامنے بیٹھ کر کچی پنسل سے لکھا، مٹا کر پکی پنسل کے ساتھ مذہب کے خانے میں مسلمانوں کے ناموں کے آگے بھی احمدی لکھتے جاتے اور بدلے میں منہ مانگا معاوضہ وصول کرتے۔ اس ”پروجیکٹ“ پر کام کے دوران میں نے ان ٹیچرز پر جماعتی فنڈ میں سے سات لاکھ روپے صرف کئے۔ اسی لئے تو میں اب چیلنج سے کہتا ہوں کہ مرزا طاہر اپنے دور میں یہ جو دعویٰ کیا کرتے تھے کہ سندھ میں اُن سے بیعت ہونے والوں کی تعداد تین کروڑ ہے، یہ دعویٰ بالکل جھوٹ پر مبنی ہے۔ سندھ میں قادیانیوں کی تعداد 30 ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور وہ لوگ بھی پیسے کی آکسیجن پر زندہ ہیں۔ باقی جو کروڑوں کے دعوے ہیں، وہ سب کاغذی کارروائی ہے۔“

”.....میری کارکردگی کو دیکھتے ہوئے 2001ء میں جماعت نے میری پوسٹنگ صوبائی نائب ناظم جماعت احمدیہ کے طور پر سندھ میں کردی۔ یہاں میں نے قادیانیت کے پرچار کے لئے ہومیوپیتھک ڈاکٹر کے روپ میں کام کا آغاز کیا اور میرپور خاص میں ڈاکٹر عبدالمنان صدیقی سے چند روز عملی تربیت لینے کے بعد مٹھی، نگرپارکر اور دوہتر کے مقام پر تین کلینک قائم کئے۔ میں چیک اپ اور دوا کے صرف 10 روپے لیتا تھا۔ میرے کلینکس پر صبح سے شام تک رش رہتا۔ ان علاقوں میں غربت بہت ہے اور میں اس کا بھرپور فائدہ اٹھاتا تھا۔ آنے والے مریضوں کو مفت دوا کے ساتھ ان کی کچھ مالی معاونت بھی کرتا تھا۔ کبھی کبھی ٹافیوں کے پیکٹ لے کر کسی گاؤں پہنچ جاتا اور بچوں اور بڑوں میں ٹافیاں تقسیم کرکے جماعت احمدیہ کے رکنیت فارم پر انگوٹھے لگوا لیتا اور ان میں مسلمان ہی نہیں ہندو بھی شامل ہوتے تھے۔ صرف اندرون تھرپارکر میں ہم نے 420 کلینکس کھول رکھے تھے اور میں ان سب کا انچارج تھا۔ میں نے بطور مربی 10 سال کے عرصے میں 1372 لوگوں کو قادیانی بنایا، جن میں سے 300 کا تعلق پنجاب سے تھا۔ سندھ میں میرا رہن سہن بڑا شاہانہ تھا۔ جماعت نے نقل و حرکت کے لئے پہلے مجھے گھوڑا فراہم کیا جس کی دیکھ بھال کے لئے میں نے تین مقامی لڑکے ملازم رکھے ہوئے تھے، جنہیں میں 200 روپے فی کس ماہانہ تنخواہ دیتا تھا۔ جلد ہی مجھے نئی لینڈ کروزر دے دی گئی۔ میری کارکردگی بھی بڑی زبردست تھی۔ اس سب کے باوجود میں نے جماعت سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا فیصلہ کیوں کیا۔ اس کی تین بڑی وجوہات ہیں۔“ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

اتوار/05اکتوبر2014ء
روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

تیسری قسط

منصور اصغر راجہ

قادیانی رہنما اخلاقی گراوٹ کا شکار ہیں!

جماعت احمدیہ سے متنفر ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ اعلیٰ عہدیداروں کی بداعمالیوں کے بارے میں جماعت کے امیر مرزا خورشید کو خط لکھا تو انہوں نے مجھے پاگل قرار دیدیا۔ اسلامیہ اسکول جھنگ کے ماسٹر نے نجات کی راہ دکھائی۔ سابق قادیانی مربی کی کہانی

اسلام قبول کرنے والے سابق قادیانی ربی نے بتایا کہ ''دورِ طالب علمی میں جب جامعہ احمدیہ میں ہمارے ہم جماعت ساتھی، سعید نے جامعہ کے پرنسپل پر جنسی تشدد کا الزام لگایا تو ہم نے سعید کو جی بھر کے گالیاں دی تھیں۔ فیلڈ میں آنے کے بعد بھی اس طرح کے کچھ واقعات میرے علم میں آئے، لیکن میں انہیں اِکا دُکا لوگوں کا ذاتی فعل سمجھتا رہا۔ تاہم جب میں جماعت کے اعلیٰ حلقوں کے قریب ہوا تو مجھ پر یہ راز کھلا کہ یہاں تو آوے کے آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ اخلاقی گراوٹ اور پستی کے ایسے ایسے واقعات سامنے آئے کہ عقل دنگ رہ گئی۔ ظاہری طور پر جو لوگ ہمیں فرشتوں سے بھی افضل نظر آتے تھے، باطنی طور پر وہ ابلیس کو بھی مات دیتے دکھائی دیئے۔ مرزا خلیل قمر چناب نگر کی مشہور علمی شخصیت ہیں۔ قادیانی خواتین کی اصلاح و تربیت کے لئے چھپنے والے جماعت احمدیہ کے رسالے ''مصباح'' کے ایڈیٹر ہیں۔ ان کے علم و فضل کے بارے میں ایک بار قادیانی خلیفہ رابع، مرزا طاہر نے کہا تھا کہ اگر کتابوں سے بھرے ہوئے پانچ سو ٹرک ایک طرف ہوں اور مرزا خلیل قمر دوسری طرف، تو مرزا خلیل قمر کا پلڑا بھاری ہوگا۔ ''انصار اللہ'' کی تاریخ بھی انہی صاحب نے لکھی۔ لیکن اس عالم فاضل شخص کا اپنا کردار یہ ہے کہ اخلاقی بے راہروی موصوف کا من پسند مشغلہ ہے۔ اسی عادتِ بد کے ہاتھوں ایک دفعہ بہت بُرے پھنسے بھی تھے۔ یہ 2007ء کی بات ہے کہ انہوں نے ایک لڑکے سے زیادتی کی۔ متاثرہ لڑکے کے اہل خانہ پولیس کے پاس پہنچ گئے۔ مرزا خلیل نے جب بات بگڑتی دیکھی تو متاثرہ فریق کو ایک لاکھ 65 ہزار روپے دے کر راضی نامہ کرلیا۔ ان میں سے 65 ہزار روپے الائیڈ بینک چناب نگر برانچ کے اکاؤنٹ سے ٹرانسفر کئے گئے اور باقی رقم نقد ادا کی گئی۔ راضی نامے کا اسٹامپ پیپر دو گواہوں کے روبرو لکھا گیا جو اب بھی محفوظ پڑا ہے۔ اگر مرزا خلیل قمر پسند فرمائیں تو وہ ان کی خدمت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ محمد بخش صادق جماعت احمدیہ کے سابق امیر اعلیٰ پاکستان ہیں۔ ان کے پاس جماعت کی کئی ذمہ داریاں ہیں۔ ناظم وقف جدید، ناظم تحریک جدید، ناظم خدمت درویشاں کے علاوہ جماعت احمدیہ کینیڈا کے امیر بھی رہے ہیں۔ نوجوان لڑکیوں سے اپنی ٹانگیں دبوانا، نوعمر لڑکوں سے زیادتی اور جماعتی اثاثوں کا بے دریغ ناجائز استعمال ان کے خاص شوق ہیں۔ سابق منیجر یو بی ایل نسیم سیفی گزشتہ 20 سال سے چناب نگر کے محلہ دارالرحمت غربی کے صدر ہیں۔ وہ مالی تعاون کے بدلے غریب خواتین کے استحصال کا کوئی موقع ضائع جانے نہیں دیتے۔ سید مبارک شاہ بھی جماعت کے بڑے بااثر اور مرکزی مبلغ ہیں۔ یہ سندھ میں میرے پیشرو تھے۔ جب میری وہاں پوسٹنگ ہوئی تو میں نے انہی سے چارج لیا تھا۔ جماعت کے اندرونی حلقوں میں موصوف کو کرپشن کا بادشاہ اور جعلی بیعت کرانے کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ جھنگ کے رہائشی ڈاکٹر اللہ بخش صادق آج کل چناب نگر کی کالونی ''بیت الحمد'' میں رہتے ہیں۔ اندرون سندھ اپنی تعیناتی کے دوران انہوں نے کئی ہندو لڑکیوں کی عزت لُوٹی۔ احسان اللہ چیمہ جماعت احمدیہ صوبہ سندھ کے ناظم ہیں۔ خالد محمود سندھو ایک اسپیشلسٹ مربی ہیں، جنہوں نے جامعہ احمدیہ چناب نگر سے سات سالہ ''شاہد'' کورس کیا ہوا ہے۔ خالد سندھو اور احسان چیمہ جامعہ میں کلاس فیلو اور گہرے دوست تھے۔ احسان چیمہ کی جب منگنی ہوئی تو وہ اپنی منگیتر سے ملنے کبھی کبھی اپنے سسرال جایا کرتے، تو خالد سندھو بھی ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ چونکہ یہ دونوں بھی پرلے درجے کے بدقماش ہیں۔ اس طرح کے کئی واقعات جب میرے علم میں آئے تو میرے دل میں قائم تقدیس، تکریم اور عقیدت کا تاج محل مسمار ہونے لگا۔ لیکن مولوی محمد دین کے بارے میں انکشافات اندھی عقیدت کے اس تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئے۔ مولوی محمد دین جماعت احمدیہ کے خلیفہ رابع مرزا طاہر کے استاد ہیں۔ موصوف بھی ایک بدعادت میں مبتلا ہیں۔ ان سے ''مستفید'' ہونے والوں میں احسن گوندل، افتخار شاکر، عبدالحفیظ، نوید اور محسن گلو کا نام زیادہ آتا ہے۔ میں اس ساری صورتحال سے اس قدر بددل ہوا کہ میں نے 2003ء میں ان تمام واقعات کے تذکرے پر مبنی 8 صفحات پر مشتمل ایک خط اُس وقت کے امیر جماعت احمدیہ پاکستان، مرزا خورشید کو بذریعہ ٹی سی ایس ارسال کیا۔ لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ پندرہ یوم تک جواب کا انتظار کرنے کے بعد میں نے ان سے فون پر رابطہ کیا اور اپنے خط کے بارے میں پوچھا کہ کیا ان افراد کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی عمل میں لائی جائیگی۔ تو انہوں نے جواباً کہا کہ ''آپ ایک پاگل انسان ہو، اس لئے آپ کے خط پر کسی قسم کا عمل نہیں ہوسکتا''۔ امیر جماعت کا یہ جواب سننے کے بعد میں نے جماعت سے علیحدگی کیلئے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کردیا۔''

''مجھے بچپن سے ہی اسکن الرجی تھی۔ جسم پر خارش کی وجہ سے میں ہر وقت پریشان رہتا، بہت علاج کرایا۔ بڑی مہنگی دوائیں اور کریمیں استعمال کیں لیکن کوئی فرق نہ پڑا۔ اسلامیہ ہائی اسکول جھنگ میں ہمارے ایک استاد ماسٹر عبدالحق صاحب ہوا کرتے تھے، جو ہمیں دسویں جماعت میں پڑھایا کرتے تھے۔ متقی مسلمان ہیں اور ماشاء اللہ اب بھی بقید حیات ہیں۔ مجھے ان سے بہت انسیت ہے۔ میں جب بھی جھنگ جاتا تو ان کی خدمت میں ضرور حاضری دیتا۔ وہ میرے خاندانی و مذہبی پس منظر سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود میرے ساتھ بے حد محبت کرتے ہیں۔ جن دنوں میں جماعت سے علیحدگی کے بارے میں سوچ رہا تھا تو ایک روز ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دورانِ گفتگو میں نے اپنی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے ان سے دعا کے لئے درخواست کی تو فرمانے لگے کہ ''میں تمہارے لئے دعا تو ضرور کروں گا لیکن تم ایک کام کرو۔ چالیس روز تک روزانہ ہر رات اپنی عبادت گاہ میں کچھ وقت اللہ کی یاد میں گزارا کرو اور اس دوران اللہ سے یہ التجا کیا کرو کہ اے میرے رب، اگر تُو نے مجھے اس بیماری سے شفا دے دی تو میں مرتے دم تک تیرا فرمانبردار بن کر رہوں گا''۔ میں نے ماسٹر صاحب کی اس ہدایت پر عمل شروع کردیا۔ ان دنوں میں ذہنی طور پر پریشان ہونے کی وجہ سے ویسے بھی تنہائی کی تلاش میں رہتا تھا۔ ماسٹر صاحب کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے 30 روز گزر چکے تھے۔ اُس رات میں منڈی بہاء الدین کے موضع ''رجوعہ'' میں ایک دوست کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ حسب معمول رات کے وقت عبادت گاہ میں بیٹھا تھا کہ میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھے کوڑھ ہوگیا ہے، میرا سارا جسم گل سڑ رہا ہے اور اپنی اس حالت کی وجہ سے میں زار و قطار رو رہا ہوں۔ اتنے میں خواب میں ہی مجھے ایک انتہائی پُرنور باریش چہرہ نظر آیا۔ ایسا حسین و جمیل چہرہ میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس شخصیت نے مجھ سے پوچھا کہ آپ رو کیوں رہے ہو۔ میں نے روتے ہوئے جواباً عرض کیا کہ میری جو حالت ہے، کیا یہ ہنسنے کے قابل ہے؟..... میرا جواب سن کر اس چہرے پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ جگمگائی اور پھر انہوں نے میرے سر پر اپنا ہاتھ پھیرنا شروع کردیا۔ پھر مجھے کہا کہ ''تمہاری بیماری ختم ہوجائے گی۔ آئندہ کوئی دوائی استعمال نہ کرنا اور اب فرمانبردار ہوجاؤ''۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی اور میرے دل میں پہلا خیال یہ آیا کہ اب مجھے تائب ہوجانا چاہئے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ دن اور آج کا دن، مجھے دوبارہ کبھی خارش کی تکلیف نہیں ہوئی۔ میں نے تمام دوائیں اور کریمیں پھینک دیں۔ اب کبھی اسکن الرجی کیلئے دوا استعمال نہیں کی۔ یہ 2006ء کی بات ہے۔'' (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

ummat.com.pk

منصور اصغر راجہ

قسط نمبر 4

پیر/06 اکتوبر 2014ء

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

"قادیانی جماعت سے بغاوت کرنے پر بیٹی کو اغوا کرلیا گیا"

قرض لے کر بیس لاکھ روپے تاوان ادا کیا۔ لیکن پولیس نے الٹا مجھے ہی موردالزام ٹھہرا دیا۔ ملازمت سے پہلے ہی نکالا جاچکا تھا۔ ''جماعت احمدیہ'' کی قیادت سے اختلاف کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کیا جاتا۔ سابق قادیانی مربی محمد نذیر کی کہانی

اسلام قبول کرنے والے سابق قادیانی مربی محمد نذیر نے بتایا کہ.....

''جب قادیانی جماعت کے کچھ سرکردہ لوگوں کی اخلاقیات سے گری ہوئی حرکتوں کے متعلق میرے خط کے جواب میں امیر جماعت احمدیہ پاکستان مرزا خورشید نے مجھے پاگل قرار دیا تو یہ بات میرے لئے کسی شاک سے کم نہ تھی۔ میں کئی روز تک اس صدمے سے باہر نہ نکل سکا۔ کیونکہ اپنی بہترین کارکردگی کی وجہ سے میں جماعت کے اعلیٰ ترین حلقوں میں بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ مجھ پر جماعتی قیادت کے اعتماد کا یہ عالم تھا کہ سابق وزیر اعلیٰ پنجاب میاں منظور وٹو کے والد نے فضل عمر ہسپتال چناب نگر میں جب زندگی کی آخری سانس لی تو اُس وقت ان کا سر میری گود میں تھا۔ کیونکہ وہ جتنے دن ہسپتال میں زیر علاج رہے، ان کی دیکھ بھال اور خدمت کے لئے جماعت نے مجھے ان کے ساتھ متعین کئے رکھا۔ سابق گورنر پنجاب سلمان تاثیر جب ابھی گورنر نہیں بنے تھے، اس وقت بھی جماعت کے اعلیٰ سطحی وفود مختلف درپیش مسائل پر تبادلہ خیال کیلئے اکثر ان سے ملاقاتیں کیا کرتے۔ اور سلمان تاثیر ان مسائل کے حل کیلئے جماعت کی ہر طرح سے معاونت کیا کرتے تھے۔ اس طرح کے کئی وفود میں، میں بھی شامل رہا اور مجھے متعدد بار سلمان تاثیر سے ملاقات اور ان کے ساتھ کھانا کھانے کا موقع ملا۔ لیکن آج جب میں نے کچھ لوگوں کی اخلاقی گراوٹ کی طرف انگلی اٹھائی تو جماعت کی قیادت کی نظر میں پاگل ٹھہرا۔ اس صورتحال کی وجہ سے اپنے کام سے میرا دل اچاٹ ہوگیا اور میں خود کو جماعت چھوڑنے کیلئے ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔ اس بات کا تو مجھے بھی یقین تھا کہ اگر جماعت کا امیر ہی میری بات پر توجہ نہیں دے رہا تو ایک عام قادیانی میری بات پر کیسے یقین کرے گا۔ اس لئے میں نے مربی کی ذمہ داری سے جان چھڑانے کیلئے بھی سوچ بچار شروع کردی۔ اس سلسلے میں پہلا قدم یہ اٹھایا کہ جماعت سے تین سال کی رخصت مانگی، جو Without Pay کی شرط کے ساتھ منظور کرلی گئی۔ چھٹی منظور ہوتے ہی میں نجی دورے پر ملائیشیا چلا گیا۔ اور پھر 2003ء سے 2005ء تک میں ملائیشیا، سنگاپور، تھائی لینڈ اور سری لنکا میں رہا۔ اس دوران زندگی کی گاڑی چلانے کیلئے مختلف مزدوریاں بھی کیں۔ اصولاً بیرون ملک سے واپسی کے بعد مجھے دوبارہ مربی کی ڈیوٹی جوائن کرنی چاہئے تھی، لیکن میں چونکہ یہ کام چھوڑنے کا فیصلہ کرچکا تھا، اس لئے اپنی ڈیوٹی پر واپس جانے کی بجائے نوکری کی تلاش شروع کردی۔ چند روز بعد ہی مجھے ہومیو پیتھک ادویات کی ڈسٹری بیوشن کمپنی ''کیوریٹو ہومیو پیتھک'' میں جاب مل گئی، جس کے مالک موجودہ ناظر امور عامہ سلیم الدین کے برادر نسبتی راجہ رشید احمد رشدی ہیں۔ یہ صاحب اپنے آپ کو رشدی کہلوا کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ میں نے یہاں کام شروع کردیا اور دوسری طرف جماعت نے ڈیوٹی پر واپس پہنچنے کا تقاضا شروع کردیا۔ اس سلسلے میں مجھے جماعت کی طرف سے متعدد بار تنبیہہ بھی کی گئی اور بطور مربی کام کرنے کا حکم دیا گیا۔ لیکن جب میری طرف سے کوئی مثبت جواب نہ ملا تو جماعت نے مجھے مربی کی ذمہ داری سے فارغ کرتے ہوئے تمام میڈیکل کارڈرز، پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات مجھ سے واپس لے لئے۔ اس کے ساتھ ہی ''کیوریٹو ہومیو پیتھک'' کی نوکری سے بھی مجھے جواب مل گیا۔ اب حالت یہ ہوگئی کہ نئی نکور لینڈ کروزر پر گھومنے والا نذیر اپنا گھر چلانے کیلئے رکشہ چلانے پر مجبور ہوگیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتا رہا کہ میں تو جماعت اور مربی کی ذمہ داری سے الگ ہونے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا، چلو اچھا ہوا کہ جماعت نے خود ہی میری جان چھوڑ دی۔ لیکن یہ میری خوش فہمی تھی۔ کیونکہ جماعت احمدیہ تو قیادت سے اختلاف رائے کی جرأت کرنے والے کسی عام قادیانی کو معاف نہیں کرتی۔ یہاں تو لاکھوں روپے صرف کرکے تیار کیا جانے والا ایک مربی جماعت سے بغاوت کی جرات کررہا تھا، جماعت اسے ٹھنڈے پیٹوں کیسے برداشت کرلیتی.....''۔

''چونکہ میں کاروباری ذہن کا مالک ہوں، اس لئے چند روز اِدھر اُدھر چھوٹی موٹی مزدوری کرنے کے بعد میں نے کوئی کاروبار کرنے کا سوچا۔ اب میں ایسا کاروبار تو کر نہیں سکتا تھا کہ جس کیلئے بھاری سرمایہ انویسٹ کرنا پڑے کہ سرمایہ کہاں سے لاتا۔ البتہ بات کرنے کا سلیقہ بھی تھا اور خوش اخلاقی کا دس سالہ تجربہ بھی تھا۔ میں نے ان دونوں صلاحیتوں سے کام لینے کا فیصلہ کیا اور چنیوٹ میں بطور مڈل مین گنے کی ٹھیکیداری شروع کردی۔ اللہ نے برکت دی اور میرا کام چل نکلا۔ اسی دوران میرے اندر ایک اور تبدیلی بھی آئی۔ اگرچہ میں اسکن الرجی سے شفایابی والا خواب دیکھنے کے بعد دل سے اسلام کی حقانیت پر ایمان لاچکا تھا، لیکن ابھی علی الاعلان قادیانیت سے تائب نہیں ہوا تھا۔ البتہ جماعت سے میں نے عملاً علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ چناب نگر میں رہتے ہوئے بھی نہ تو میں جماعت کی مذہبی تقریبات میں شرکت کرتا اور نہ ہی جماعت کو چندہ دیتا۔ علاقے کے مسلمانوں کے ساتھ میرا اٹھنا بیٹھنا زیادہ ہوگیا۔ بلکہ میں اکثر ان کی مسجد میں بھی چلا جاتا۔ جماعت میری سرگرمیوں کو واچ کررہی تھی۔ اس کا پتہ مجھے ایسے چلا کہ جب ایک روز مجھے صدر دفتر عمومی طلب کرکے کہا گیا کہ ''آپ کی حرکات ٹھیک نہیں ہیں۔ آپ اس پر توجہ دیں۔ ورنہ آپ کو اس کے سنگین نتائج بھگتنا پڑ سکتے ہیں''۔ میں نے اس دھمکی کا جواب اس طرح دیا کہ چناب نگر والا گھر چھوڑ کر قریبی پہاڑی کے دامن میں سرکاری اراضی پر ایک کچا کمرہ بنایا اور بیوی کے ہمراہ وہاں رہنے لگا اور پوری توجہ اپنے کاروبار پر مرکوز کردی''۔

''.....وہ 7 جنوری 2007ء کی صبح تھی۔ گھڑی غالباً سات بج کر چالیس منٹ بجا رہی تھی۔ میں اپنی چھ سالہ بیٹی عروسہ نذیر کو راجیکی روڈ پر واقع اس کے اسکول ''ٹوئنکل اسٹار اکیڈمی'' چھوڑنے کیلئے گھر سے نکلا۔ ہم باپ بیٹی موٹر سائیکل پر جارہے تھے۔ جب راجیکی روڈ پر چڑھے تو پیچھے سے آنے والی ایک 86 ماڈل کرولا کار میں سے کسی نے آواز دی ''ٹھیکیدار صاحب ذرا رکنا''۔ میں سمجھا کہ شاید کوئی مقامی زمیندار ہے، جو گنے کی فصل کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے موٹر سائیکل روک لی۔ میرے رکتے ہی کار میں سے تین نامعلوم مسلح افراد نکلے۔ انہوں نے مجھ سے میری بیٹی اور موٹر سائیکل چھینی، میری جیب میں موجود تین ہزار روپے نکالے اور چلتے بنے۔ میں نے تھانہ چناب نگر اطلاع دی تو پولیس نے بچی کی بازیابی کیلئے کوششیں شروع کردیں۔ چند روز گزر گئے، لیکن بچی نہ مل سکی۔ اسی دوران نامعلوم نمبرز سے مجھے کالیں آنے لگیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کی کال اُس وقت آتی جب میں تھانے آتا۔ تھانے سے باہر نکلتے ہی میرا موبائل فون بجنے لگتا اور کسی نامعلوم نمبر سے کال کرنے والا شخص مجھے کہتا، ''تھانے سے ہو آئے ہو، اچھی بات ہے، لیکن کیا اس طرح تمہیں تمہاری بیٹی مل جائے گی۔ تم نے بہت کاروبار کرلیا ہے۔ اب اگر اپنی بیٹی کو زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو اس میں سے ہمارا بھی کچھ حصہ نکالو''۔ وہ لوگ چند روز تک اسی طرح میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے رہے اور پھر ایک روز انہوں نے مجھ سے بیٹی کے بدلے 50 لاکھ روپے تاوان مانگ لیا۔ میرے منت سماجت کرنے پر 20 لاکھ روپے میں معاملہ طے ہوا۔ لیکن میرے لئے یہ بھی بہت بڑی رقم تھی۔ میں اتنے پیسے کہاں سے لاتا۔ چونکہ گنے کا سیزن چل رہا تھا۔ کئی زمینداروں کے بل میرے پاس پڑے تھے۔ میں نے انہیں منت سماجت کرکے اس بات پر راضی کیا کہ اگر وہ مجھے اپنی رقم استعمال کرنے کی اجازت دیں، تو انہیں میں چند روز ٹھہر کر ادائیگی کردوں گا۔ کچھ قریبی دوستوں سے ادھار پیسے پکڑے اور اس طرح کرکرا کے 20 لاکھ روپے جمع کئے۔ اغوا کاروں نے تاوان کی ادائیگی کیلئے مجھے رات ایک بجے فیصل آباد کے علاقے ستیانہ بنگلہ میں جھامرہ روڈ پر واقع چک نمبر 238 گ ب شیر کا، کے قریب سے گزرنے والی نہر کے پُل پر بلایا۔ تاوان وصول کرنے کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگلے روز دوپہر کے وقت چناب نگر ریلوے اسٹیشن پر آنے والی ایک ٹرین کے ڈبے سے مجھے میری بیٹی مل جائے گی۔ اگلے روز ایسا ہی ہوا اور چھ روز بعد مجھے میری بیٹی مل گئی۔ بچی بازیاب ہوتے ہی چناب نگر کی پولیس حرکت میں آئی اور مجھے میرے گھر سے اٹھا کر تھانہ چناب نگر کی حوالات میں بند کردیا۔ مجھ پر میری ہی بیٹی کو اغوا کرانے کا الزام تھا۔ اُس روز پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ جماعت نے مجھے سبق سکھانے کا فیصلہ کرلیا ہے اور اب آزمائش کا دور شروع ہونے والا ہے''۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

ummat.com.pk

منصور اصغر راجہ

قسط نمبر 5

جمعرات/09 اکتوبر 2014ء

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

”قادیانی رہنماؤں کی ایما پر تھانے میں بدترین تشدد کیا گیا“

شدید ”چھترول“ کے علاوہ جسم کو سگریٹوں سے داغا گیا- قادیانی رہنما چاہتے تھے میں اپنی بیٹی کے اغوا کی ذمہ داری قبول کروں- جماعت احمدیہ سے وفاداری ثابت کرنے کیلئے اہل خانہ نے بھی منہ موڑ لیا- سابق قادیانی مربی محمد نذیر کی کہانی

اسلام قبول کرنے والے سابق قادیانی مربی محمد نذیر نے بتایا..... ”بیٹی کی بازیابی کے بعد اگلے تین روز تک مجھے جماعت احمدیہ کے دفتر عمومی بلوایا جاتا رہا، جہاں دفتر عمومی کا کارِ خاص ناصر بلوچ مجھے یہ دھمکی آمیز پیغام دیتا کہ ”آخری بار کہہ رہا ہوں کہ اب بھی وقت ہے کہ تم سُدھر جاؤ“، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی تین روزہ ”نصیحت“ کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا تو اگلے ہی روز مجھے اپنے گھر سے اٹھا کر تھانہ چناب نگر کی حوالات میں پہنچا دیا گیا۔ ساری شام اسی اُدھیر بن میں گزری کہ مجھے کس الزام کے تحت یہاں لایا گیا ہے۔ جب گھڑی نے رات کے گیارہ بجائے تو ایک اہلکار مجھے حوالات سے نکال کر تھانے کے ایک الگ کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی میں نے دیکھا کہ صدر دفتر عمومی اللہ بخش صادق، قادیانی نواز ڈی ایس پی سعید اختر قتلہ، مقامی ایس ایچ او یاسر پنسوتہ، چوکی انچارج چوہدری اصغر، صدر محلہ باب الابواب نذیر احمد شیشے والا اور ناصر بلوچ سامنے ہی کرسیوں پر ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھے تھے۔ ان لوگوں نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں تحریری طور پر یہ الزام قبول کروں کہ میری بیٹی کا اغوا ایک خود ساختہ ڈرامہ تھا اور میں نے اسے خود اغوا کرایا تھا۔ میں نے یہ سب لکھ کر دینے سے انکار کر دیا۔ میرا انکار سنتے ہی میرے اردگرد کھڑے پولیس اہلکار مجھ پر پل پڑے۔ انہوں نے مجھے مکمل طور پر برہنہ کرنے کے بعد اُلٹا لٹایا اور چھترول شروع کر دی۔ ایک اہلکار با آواز بلند گنتی کر رہا تھا اور باقی مجھے مار رہے تھے۔ انہوں نے گن کر مجھے 100 لِتر مارے۔ 40 کے بعد میں درد اور تکلیف سے قدرے بے نیاز ہو گیا۔ گنتی پوری ہونے کے بعد انہوں نے مجھے ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے اٹھایا اور لا کر حوالات میں پھینک دیا۔ میری حالت دیکھ کر وہاں بند دیگر حوالاتی بھی سہم گئے۔ ہمارے علاقے کا نامی گرامی چور ”یارو موچی“ بھی اس وقت حوالات میں بند تھا۔ اس نے میرا سارا جسم دبایا، سنتری سے کہہ سن کر تھوڑا سا تیل منگوایا اور مجھے مالش کی۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد میرے حواس بحال ہوئے اور میں اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہوا۔ لیکن یہ تو ابھی ابتدا تھی۔ مجھے چار روز تک حوالات میں بند رکھا گیا۔ اس دوران پولیس نے مجھ پر تشدد کا ہر ہر حربہ آزمایا۔ وہ بار بار مجھے منجی (چارپائی) پر چڑھاتے تھے۔ چارپائی الٹی کر کے وہ میرے ہاتھ پاؤں چاروں پایوں کے ساتھ باندھ کر چارپائی سیدھی کر دیتے۔ ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کی وجہ سے سارا زور میرے جسم پر پڑتا تو مجھے ایسے لگتا کہ میرے جسم کا ایک ایک جوڑ الگ ہو رہا ہے۔ یہ اس قدر تکلیف دہ عمل تھا کہ میں چند منٹ ہی برداشت کر پاتا۔ ان چار دنوں میں بار بار میرے جسم کو سگریٹوں سے جلایا جاتا رہا۔ لوہے کے سریے کو آگ میں گرم کر کے میری پنڈلیوں کو داغا جاتا، جس کے نشان اب تک موجود ہیں۔ میری رانوں پر رولر پھیرا جاتا، جس کے باعث میری چیخوں سے سارا تھانہ گونج اٹھتا۔ لیکن مجھ پر تشدد کرنے والے میری چیخ و پکار سے محظوظ ہوتے اور ان کا ایک ہی مطالبہ ہوتا کہ میں اپنی جاں بخشی چاہتا ہوں تو انہیں لکھ کر دوں کہ اپنی بیٹی کے اغوا کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ لیکن اس قدر مار کھانے کے بعد بھی میں یہ الزام قبول نہ کر سکا۔ یارو موچی مجھے کہتا تھا کہ ”پولیس کے تشدد کو سب سے زیادہ چور برداشت کرتا ہے، کیونکہ وہ مار کھانے کا عادی ہوتا ہے۔ لیکن جتنا تشدد تم پر ہوا ہے، اگر مجھ پر ہوتا تو شاید میں بھی برداشت نہ کر پاتا“۔ دراصل یارو موچی اصل بات سے واقف نہیں تھا کہ مجھ پر یہ تشدد کیوں ہو رہا تھا۔ بیٹی کے اغوا کا الزام تو محض ایک بہانہ تھا۔ اصل جرم تو جماعت احمدیہ سے میری بغاوت تھی۔ میں چونکہ اصل معاملے سے بخوبی واقف تھا، اسی لئے پولیس کا ہر ستم میرا حوصلہ بڑھاتا رہا اور میں اپنے موقف میں مزید پختہ ہوتا چلا گیا۔ جماعت احمدیہ کے خلاف میرے دل میں نفرت بڑھتی رہی۔ اس دوران میری تذلیل کا بھی خوب انتظام کیا گیا۔ چناب نگر کے مختلف گھرانوں کے لوگ اپنے بچوں سمیت تھانہ چناب نگر آتے، مجھے حوالات میں بے یار و مددگار پڑا دیکھ کر ہنستے مسکراتے، مجھ پر آوازے کستے، تمسخر اُڑاتے اور مجھ پر باقاعدہ لعنت بھیج کر واپس چلے جاتے۔ کچھ ”خیر خواہ“ مجھے واپس لوٹ آنے اور ایک اطاعت گزار احمدی بن کر زندگی گزارنے کا ”مشورہ“ بھی دیتے۔ یہ ساری صورتحال میرے لئے انتہائی تکلیف دہ تھی۔ کیونکہ میرا تعلق ایک انتہائی بااثر قادیانی گھرانے سے تھا۔ میرے گھرانے کے اثر و رسوخ کا اندازہ کرنے کیلئے یہ ایک مثال ہی کافی ہے کہ 1988ء میں میرے بڑے بھائی محمد رفیع کی جھنگ میں جوتوں کی دکان ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے جوتے رکھنے والے شوکیس کے باہر شیشے پر کلمہ طیبہ کا اسٹکر لگا رکھا تھا۔ چونکہ امتناع قادیانیت آرڈیننس 1984ء کے تحت یہ قانوناً جرم ہے، اس لئے کسی مقامی مسلمان کی شکایت پر ایک مجسٹریٹ نے ہماری دکان پر چھاپہ مارا۔ اس ”گستاخی“ پر میرے بڑے بھائی نے اس مجسٹریٹ کو بھرے بازار میں تھپڑ مارے تھے۔ پولیس بھائی کو تھانے لے گئی۔ ڈاکٹر عبدالسلام ان دنوں برطانیہ میں تھے۔ گھر والوں نے ان سے رابطہ کیا۔ انہوں نے وہاں سے ایس پی جھنگ کو فون کیا اور آدھے گھنٹے بعد پولیس میرے بھائی کو عزت و احترام کے ساتھ گھر چھوڑ گئی۔ اس گھرانے کا ایک چشم و چراغ آج بے بسی کے عالم میں تھانہ چناب نگر کی حوالات میں پڑا تھا۔ اپنی اس بے بسی پر اگرچہ میری آنکھیں بھیگ جاتیں، لیکن یہ سوچ کر دل کو اک گونہ اطمینان بھی ہوتا کہ مجھ پر ہونے والے اس ظلم و تشدد کی وجہ میرا کسی اخلاقی جرم میں مبتلا ہونا نہیں ہے۔ بلکہ مجھے جماعت احمدیہ سے بغاوت اور قادیانیت سے نفرت کے جرم میں اس آزمائش سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ یہی وہ سوچ تھی جو مجھے پولیس کا تشدد برداشت کرنے کا حوصلہ دیتی تھی۔ حوالات میں گزرنے والے وہ چار دن انتہائی صبر آزما تھے۔ اس دوران مجھے بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ دیگر حوالاتیوں کی روٹی میں سے جو چند ٹکڑے بچتے، میں انہیں پانی کے ساتھ نگل لیتا۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ مصیبت کی اس گھڑی میں میرے اپنوں نے بھی مجھ سے منہ موڑ لیا تھا۔ والدین، بہن بھائی، اہلیہ اور سسرال والے مجھے چھوڑ کر جماعت کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ وہ سب میرے حالات سے مکمل طور پر باخبر تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس سارے معاملے سے لاتعلق رہے۔ انہوں نے پولیس سے کوئی رابطہ کیا نہ تھانے آ کر مجھ سے ملنے کی کوشش کی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے میں ان کے لئے مر چکا ہوں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ مجھ پر بیٹی کے اغوا کا الزام محض ایک فریب تھا، اصل معاملہ تو کچھ اور تھا۔ اسی لئے میرے گھر والوں حتیٰ کہ میری بیوی نے بھی میرے کیس میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ بلکہ اس معاملے سے لاتعلق رہ کر انہوں نے جماعت سے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس وقت تک میں نے قادیانیت سے تائب ہونے اور اسلام قبول کرنے کا اعلان نہیں کیا تھا۔ صرف جماعت سے عملاً علیحدگی اختیار کی تھی۔ لیکن میرا یہ جرم بھی گھر والوں کیلئے قابل قبول تھا نہ جماعت احمدیہ کے لئے۔ اسی دوران میرے ایک وکیل دوست سید زید محسن کاظمی ایڈووکیٹ کو میرے حالات کی خبر ہوئی تو انہوں نے میری بازیابی کے لئے عدالتی بیلف کا پروگرام بنایا۔ کسی طرح چناب نگر پولیس کو بھی اس کی خبر ہو گئی، تو انہوں نے فوری طور پر میرے خلاف اغوا کا جھوٹا مقدمہ درج کر کے اگلے روز ریمانڈ کے لئے مجھے ایڈیشنل سیشن جج چنیوٹ عقیل نذیر کی عدالت میں پیش کر دیا۔ میری اس وقت یہ حالت تھی کہ مجھ سے ٹھیک طرح سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میرے ساتھ آنے والے دو پولیس اہلکاروں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ جج صاحب نے میری طرف دیکھا اور مجھ سے کچھ پوچھا۔ میں چند ثانیے ان کی طرف دیکھتا رہا اور پھر ایک عجیب سی حرکت کی۔ میری اس حرکت پر جہاں جج صاحب کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے، وہیں مجھے عدالت لانے والے سب انسپکٹر اور دو سپاہیوں کے رنگ بھی فق ہو گئے اور میرے پیچھے کھڑے سب انسپکٹر نے بھری عدالت میں اوئے اوئے کرتے ہوئے میری گدی پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا“۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

ummat.com.pk

جمعۃ المبارک/10 اکتوبر 2014ء

قسط نمبر 6

منصور اصغر راجہ

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

”چناب نگر میں قادیانیت ترک کرنے والوں کا کوئی پرسان حال نہیں“

جماعت احمدیہ کے مظالم پر پولیس بھی کارروائی نہیں کرتی۔ مخصوص ہتھکنڈوں سے مرتد ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ جسم پر تشدد کے نشانات دیکھ کر عدالت نے مجھے بری کر دیا۔ لیکن قادیانی ذمہ داران کی سازشیں جاری رہیں۔ سابق قادیانی مربی کی کہانی

قادیانیت سے تائب ہونے والے سابق قادیانی مربی محمد نذیر نے اپنی داستان حیات سناتے ہوئے بتایا..... ”جب مجھے ایڈیشنل سیشن جج چنیوٹ کی عدالت میں پیش کرنے کیلئے لے جایا جا رہا تھا تو میں مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ میں عدالت میں اپنی بے گناہی کیسے ثابت کروں گا۔ پولیس کا مجھ پر سخت دباؤ تھا کہ میں عدالت میں پولیس تشدد کے متعلق یا پولیس کے خلاف ایک لفظ بھی نہ کہوں۔ ایس ایچ او تھانہ چناب نگر نے عدالت لے جانے کیلئے مجھے ڈبل ہتھکڑی لگائی اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ ”یاد رکھنا، اگر تم نے ہمارے خلاف ایک لفظ بھی بولا تو واپس ہمارے پاس ہی آنا ہے“۔ پولیس کے بہیمانہ تشدد نے میرا دماغ اس قدر ماؤف کر دیا تھا کہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ دنیا کو کیسے بتاؤں کہ ایک باپ اپنی ہی بیٹی کو کیسے اغوا کر سکتا ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں مجھے عدالت کے کٹہرے میں پہنچا دیا گیا۔ میں جج صاحب کے سامنے کھڑا تھا اور وہ مجھ سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ پھر نہ جانے میرے جی میں کیا آئی کہ میں نے یکدم نیچے سے اپنے آپ کو برہنہ کر دیا۔ میری اس حرکت پر فوری طور پر دو ردعمل ظاہر ہوئے۔ پہلا یہ کہ جج صاحب کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے۔ دوسرا میرے پیچھے کھڑے سب انسپکٹر کا میری گدی پر زوردار تھپڑ پڑا۔ لیکن جیسے ہی جج صاحب کی نظر میرے نچلے حصے پر جلے ہوئے زخموں پر پڑی تو وہ ہکا بکا رہ گئے۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے ایک کڑی نظر سے مجھے لانے والے پولیس اہلکاروں کی طرف دیکھا تو ان کے رنگ پھیکے پڑ گئے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ کمرہ عدالت پہ سکوت طاری تھا۔ جج صاحب خاموش بیٹھے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میرا سر جھکا ہوا تھا۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ لب کانپ رہے تھے۔ میں بہت کچھ کہنا چاہ رہا تھا، لیکن لفظ میری زبان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد جج صاحب نے میری دل جوئی کیلئے چند ہمدردانہ جملے کہے اور پھر مجھے کسی ڈر اور خوف کے بغیر اپنا موقف کھل کر عدالت کے سامنے بیان کرنے کا حکم دیا۔ اس پر میں نے جج صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ ”سرکار! میری سمجھ کے مطابق اگر کوئی باپ اپنی ہی بیٹی کے اغوا کا ڈرامہ رچائے تو اس کی تین وجوہات ہو سکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ اس ڈرامے سے کوئی ذاتی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دوسری یہ کہ اگر کسی کی اپنی بیوی یا سسرال والوں سے کوئی ناچاقی ہو تو وہ انہیں اذیت دینے کیلئے ایسی قبیح حرکت کرتا ہے۔ تیسری یہ کہ بعض لوگ اپنے دشمنوں کو جھوٹے مقدمے میں پھنسانے کیلئے بھی اس طرح کے ڈرامے رچاتے ہیں۔ لیکن میرے کیس میں یہ تینوں باتیں دکھائی نہیں دیتیں۔ میں اس ڈرامے سے کوئی ذاتی مفاد تو کیا حاصل کرتا، اُلٹا اغوا کاروں نے مجھ سے 20 لاکھ روپے تاوان لیا اور یہ رقم بھی میں نے اِدھر اُدھر سے قرض لے کر پوری کی۔ میں ایک خوشگوار گھریلو زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میری اپنی بیوی سے کوئی ناچاقی ہے نہ سسرال والوں سے کوئی جھگڑا۔ تیسری بات یہ کہ میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ نہ ہی میرا ایسا کوئی مخالف ہے جسے جھوٹے مقدمے میں پھنسانے کیلئے میں ایسی گھٹیا حرکت کروں“۔ جج صاحب نے میری بات اطمینان سے سنی اور پھر پولیس کی سرزنش کرتے ہوئے فوری طور پر میری باعزت رہائی کا حکم دے دیا۔ لیکن رہائی کے بعد بھی جماعت احمدیہ نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ مختلف ذرائع سے ملنے والی دھمکیوں کا سلسلہ تو جاری تھا ہی، اس کے علاوہ بھی جماعت نے میرا حقہ پانی بند کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ میری اہلیہ تو اسی وقت مجھے ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر اپنے میکے چلی گئی تھی، جب پولیس نے مجھے بیٹی کے اغوا کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔ میں نے دوبارہ چناب نگر میں رہائش اختیار کرنے کی کوشش کی تو جماعت کی طرف سے حکم جاری کیا گیا کہ کوئی بھی شخص مجھے اپنا گھر کرائے پر نہ دے۔ لہٰذا مجھے ایک مضافاتی آبادی میں رہائش اختیار کرنی پڑی۔ 20 لاکھ روپے تاوان کی ادائیگی کے بعد گنے کی ٹھیکیداری تو کہیں پیچھے رہ گئی تھی، بلکہ اب تو اس بھاری رقم کی واپسی ہی میرے لئے سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ دوسری جانب پیٹ کا دوزخ بھرنے کیلئے بھی کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔ انہی دنوں میرے ایک غمگسار قادیانی دوست رفیق جٹ نے مجھے مظفر آباد میں نیلم جہلم پراجیکٹ کے بارے میں بتایا کہ اگر میں وہاں کوشش کروں تو مجھے کوئی چھوٹی موٹی نوکری مل سکتی ہے۔ میں نے رفیق جٹ کے مشورے پر عمل کیا تو مجھے وہاں باورچی کی نوکری مل گئی۔ وہاں گزرنے والے چند ماہ قدرے پُرسکون تھے۔ لیکن پھر اچانک مجھے وہاں سے بھی نکلنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ نیلم جہلم پراجیکٹ کے ہیڈ آفس لاہور سے لے کر مظفر آباد میں سائٹ تک غیر ملکیوں کے علاوہ جو مقامی لوگ کام کر رہے ہیں، ان میں صرف دس فیصد مسلمان ہیں، جبکہ 90 فیصد قادیانی ہیں۔ ابتدا میں تو انہوں نے میری خوب آؤ بھگت کی۔ لیکن جیسے ہی انہیں خبر ملی کہ میں جماعت احمدیہ سے بغاوت کے جرم میں آج کل زیر عتاب ہوں تو انہوں نے میرا ایسا ناطقہ بند کیا کہ مجبوراً مجھے وہاں سے نکلنا پڑا۔ واپس آ کر میں نے دوبارہ رفیق جٹ سے رابطہ کیا۔ اس کی چناب نگر میں دودھ دہی کی دکان تھی اور وہ پہلے بھی کئی مواقع پر خاموشی سے میری مدد کر چکا تھا۔ ہم نے باہم مل کر کھیتی باڑی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے چنیوٹ کے کچھ زمینداروں سے رابطہ کر کے 122 ایکڑ زرعی اراضی ٹھیکے پر لی اور کام شروع کر دیا۔ کچھ مسلمان دوستوں کی مہربانی سے ادھار پر ضروری زرعی آلات خریدے اور پہلی فصل اترتے ہی ادائیگی کا وعدہ کیا۔ اس کے علاوہ تاوان والے 20 لاکھ روپے کی واپسی کا تقاضا بھی اب بڑھنے لگا تھا۔ مجھے اس کی بھی فکر کھائے جا رہی تھی۔ انہی حالات میں کھیتی باڑی شروع کی اور چاول کی فصل کاشت کی۔ اس دوران میرا سابقہ معمول دوبارہ بحال ہو گیا۔ مسلمان دوستوں سے تعلق پہلے سے زیادہ بڑھ گیا اور اب میں نے کھلے عام ان کی مساجد میں جانا شروع کر دیا۔ جب فصل پک کر تیار ہوئی تو کٹائی کے دوران پہلے میرے والد فوت ہوئے اور پھر تین دن کے وقفے سے بڑے بھائی محمد رفیع بھی انتقال کر گئے۔ اگرچہ وہ لوگ مجھے چھوڑ چکے تھے، لیکن باپ اور بھائی کے انتقال پر صدمہ ایک فطری امر تھا۔ چند روز سخت پریشانی میں گزرے۔ اسی دوران رفیق جٹ نے فصل کی کٹائی مکمل کرائی اور تمام فصل غلہ منڈی چنیوٹ میں فروخت کرنے کے بعد خود ہی حساب کتاب کر کے مجھے اطلاع دی کہ ہماری چاول کی پہلی فصل 65 لاکھ روپے کی ہوئی، جس میں سے میرے حصے میں 35 لاکھ روپے آئے تھے۔ اس نے مجھے 10 دسمبر 2010ء کو 35 لاکھ روپے کا چیک دیا اور کہا کہ اگلے ایک دو روز میں رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل ہو جائے گی۔ اس چیک کا نمبر A 11697458 تھا اور وہ یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ چناب نگر برانچ کا چیک تھا، جہاں رفیق جٹ نے اپنا کرنٹ اکاؤنٹ کھلوا رکھا تھا، جس کا نمبر 01013064 تھا۔ لیکن رقم میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر نہ ہو سکی۔ دو روز بعد بینک نے تحریری طور پر بتایا کہ مذکورہ اکاؤنٹ میں مطلوبہ رقم نہیں ہے۔ بعد میں مجھے کچھ ذرائع سے پتہ چلا کہ جب جماعت کو میری اور رفیق جٹ کی شراکت داری کا علم ہوا تو قادیانی ذمہ داران نے اسے دفتر طلب کر کے سخت سرزنش کی اور اس کے بعد نہ رقم میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوئی اور نہ ہی رفیق جٹ چناب نگر میں دکھائی دیا۔ وہ وہاں سے ایسے غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اب اصولاً تو چیک ڈس آنر ہونے پر رفیق جٹ کے خلاف قانونی کارروائی ہونی چاہئے تھی، لیکن ایسا نہ ہوا۔ یہاں یہ بھی بتا دوں کہ چناب نگر میں قادیانیت سے تائب ہو کر مسلمان ہونے والوں کا کوئی پُرسان حال نہیں۔ جماعت احمدیہ کی طرف سے ان پر ڈھائے جانے والے مظالم پر چناب نگر تھانے میں ان کی شنوائی اور دادرسی تو دور کی بات ہے، اُلٹا پولیس انہیں اپنے مخصوص ہتھکنڈوں کے ذریعے واپس قادیانیت کی طرف لوٹ جانے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کی ایک مثال ڈی ایس پی سعید اختر قلتہ ہے، جس نے مسلمان ہوتے ہوئے بھی قادیانیوں کے اشارے پر مجھ پر تشدد کرایا۔ اسی طرح جماعت کے مظالم کے خلاف کئی لوگوں کی درخواستیں اب بھی تھانہ چناب نگر میں پڑی ہوئی ہیں، لیکن ان پر کوئی عملدرآمد نہیں ہو رہا۔ چیک ڈس آنر ہونے کی وجہ سے صورت حال یہ ہوئی کہ مجھ پر کم از کم بیس پچیس لاکھ روپے کا قرضہ چڑھ گیا اور میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ مجبوراً مجھے چناب نگر چھوڑنا پڑا۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

ummat.com.pk

روزنامہ امت کراچی/حیدرآباد

”اسلام قبول کرنے والے تین نوجوانوں کو زندہ جلا دیا گیا“

احمد-ندیم اور حفیظ طاہر آباد کے رہائشی تھے-قادیانیت سے بغاوت کی سزا اولاد چھین کر بھی دی جاتی ہے-چناب نگر میں کسی کے پاس بھی جائیداد کے مالکانہ حقوق نہیں-پورے علاقے میں قادیانی جماعت کی متوازی حکومت ہے-سابق قادیانی مربی کی کہانی

اسلام قبول کرنے والے سابق قادیانی مربی محمد نذیر نے بتایا کہ.....

”چناب نگر میں جماعتی قیادت سے معمولی سا اختلاف کرنے والوں کا حقہ پانی تو بند کیا ہی جاتا ہے، لیکن جو لوگ قادیانیت پر لعنت بھیج کر دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہیں، انہیں ایسے ظالمانہ طریقے سے نمونہ عبرت بنایا جاتا ہے کہ دوبارہ کوئی ایسی جرات نہ کر سکے۔ جبکہ مقامی پولیس ایسے جرائم کی مکمل طور پر پردہ پوشی کرتی ہے۔ اس کی ایک مثال 2011ء میں وقوع پذیر ہونے والا ایک واقعہ ہے۔ چناب نگر کے علاقے طاہر آباد کے رہائشی تین لڑکے احمد، ندیم اور حفیظ مسلمان ہو گئے۔ ان کی عمریں 20 سے 25 سال کے لگ بھگ تھیں۔ جماعت نے انہیں مختلف حیلوں بہانوں سے ”سمجھانے“ کی کافی کوشش کی، لیکن یہ تینوں نوجوان اپنے ایمان پر ڈٹے رہے۔ جب جماعت نے دیکھا کہ ان کی کوششیں رائیگاں جا رہی ہیں تو پھر ایک روز نائب صدر دفتر عمومی ڈی ایس پی (ر) حمید اللہ قریشی کے بھائی سابق پولیس انسپکٹر بشیر بلا نے ان تینوں کو اپنے ڈیرے پر بلایا اور آخری بار سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن جب ان تینوں نے قادیانیت کی طرف واپس لوٹنے سے واضح انکار کر دیا تو ان پر پیٹرول چھڑک کر تینوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان تینوں نوجوانوں کے ورثا اپنے بچوں کے اس ظالمانہ قتل سے بخوبی واقف تھے، لیکن انہوں نے قادیانی ہونے کی وجہ سے جماعت احمدیہ سے وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے یا کسی خوف کے سبب قاتلوں کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرنے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ چند روز بعد اس واقعے کو حادثہ قرار دے کر فائل بند کر دی گئی۔ مقتولین کے ورثا کی خاموشی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان تینوں ”باغی“ نوجوانوں کو زندہ جلائے جانے کا فیصلہ کہیں اور کیا گیا تھا۔ بشیر بلا نے تو صرف اس فیصلے پر عملدرآمد کیا تھا۔ چناب نگر میں یہ معمول کی بات ہے کہ اگر کسی ”باغی“ کو ٹھکانے لگایا جائے تو اولاً تو اس کے ورثا کوئی قانونی کارروائی نہیں کرتے۔ اور اگر معاملہ زیادہ بگڑ جائے یا میڈیا پر آ جائے تو پھر پہلے ورثا کی طرف سے مقدمہ درج کرایا جاتا ہے اور پھر چند روز بعد انہیں کچھ رقم بطور دیت ادا کر کے صلح کر لی جاتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ چناب نگر میں رہنے والے سب لوگ یہ کام اپنی خوشی سے نہیں کرتے، بلکہ کئی مجبوریوں نے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں اور وہ بہت سے کام اپنی مرضی کے برخلاف اور جماعت کی مرضی کے مطابق کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جماعتی قیادت نے اپنی ”امت“ پر بے شمار چندے عائد کر رکھے ہیں۔ جب میں جامعہ احمدیہ میں زیر تعلیم تھا، اس وقت ہر قادیانی سے 25 مختلف مدات میں چندہ لیا جاتا تھا۔ اب تو سنا ہے کہ جب سے مرزا مسرور نے ”خلافت“ سنبھالی ہے، چندے کی کچھ مزید مدات بڑھا دی گئی ہیں۔ اسی طرح جو لوگ چناب نگر میں رہائش اختیار کرتے ہیں، انہیں وہاں زمین، جائیداد کے مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہوتے۔ چناب نگر کا تمام رقبہ 99 سالہ لیز پر جماعت احمدیہ کے نام ہے۔ جو قادیانی وہاں اپنا گھر بنانا چاہے، اس سے ایک فارم بھروا کر جماعت اسے سادہ کاغذ کی ایک چٹ پر پلاٹ کا الاٹی نمبر لکھ کر تھما دیتی ہے۔ اس موقع پر خریدار سے یہ تحریری ضمانت لی جاتی ہے کہ وہ یہ زمین کسی غیر قادیانی کو کسی بھی صورت فروخت نہیں کر سکتا۔ اگر وہ کسی قادیانی کو بھی فروخت کرنا چاہے تو اس کیلئے بھی جماعت سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ چونکہ چناب نگر میں کسی کے پاس بھی جائیداد کے مالکانہ حقوق نہیں، اس لئے بغاوت کرنے والوں کے گھر اور جائیداد پر جماعت کا قبضہ عام معمول ہے۔ پھر بغاوت کرنے والوں کو جذباتی طور پر بلیک میل کیا جاتا ہے۔ اگر کسی باغی کے بچے چھوٹے ہوں تو جماعت وہ بچے چھین لیتی ہے۔ اس کی ایک مثال میں خود ہوں۔ میری دو بیٹیاں سابقہ بیوی اپنے ساتھ لے گئی۔ اب جماعت کی طرف سے مجھے ان سے ملنے کی قطعاً اجازت نہیں۔ اسی طرح ہمارے ایک ساتھی شیخ زبیر انور ہیں، جنہوں نے 2002ء میں اسلام قبول کیا۔ اس وقت ان کی اکلوتی بیٹی دو ڈھائی سال کی تھی۔ وہ بچی ان سے چھین لی گئی۔ وہ گزشتہ بارہ سال سے اپنی بیٹی حاصل کرنے کیلئے کوشاں ہیں، لیکن ابھی تک انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اب بھی اس سلسلے میں چنیوٹ کی ایک مقامی عدالت میں ان کا کیس چل رہا ہے“۔

محمد نذیر نے مزید بتایا کہ ”شیخ زبیر انور کا بھی عجیب قصہ ہے۔ اللہ نے ان کی ہدایت کیلئے کیا خوبصورت اسباب پیدا کئے۔ ایک ملاقات میں وہ مجھے بتا رہے تھے کہ ان کا تعلق لاہور سے ہے، بعد ازاں چناب نگر منتقل ہو گئے۔ وہ پیدائشی قادیانی تھے اور 38 برس تک قادیانیت سے وابستہ رہے۔ درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ شیخ زبیر کا کسی گھریلو مسئلے پر بیوی سے جھگڑا ہو گیا۔ دفتر عمومی کی طرف سے انہیں اس جھگڑے میں ثالثی کا پیغام دیا گیا۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر دفتر آنے سے انکار کر دیا کہ یہ ان کا گھریلو مسئلہ ہے، جماعت اس میں مداخلت نہ کرے۔ جماعت ان کے اس ”حرفِ انکار“ پر اس قدر تلملائی کہ چند روز بعد کچھ لڑکے زبردستی ان کے گھر میں داخل ہوئے اور انہیں اٹھا کر دفتر عمومی لے آئے۔ اس وقت دفتر عمومی کے انچارج میجر (ر) شاہد سعدی اور نائب صدر ڈی ایس پی (ر) حمید اللہ قریشی ہوا کرتے تھے۔ دفتر عمومی میں شیخ زبیر پر شدید تشدد ہوا اور انہیں وہاں چند روز تک محبوس رکھا گیا۔ اس دوران ان کے گھر پر قبضہ ہوا۔ اس سلسلے میں ان کی قادیانی بیوی نے جماعت کا بھرپور ساتھ دیا۔ پھر ایک روز انہیں شام کے وقت وہاں سے نکال کر ایک گاڑی میں بٹھایا گیا اور چنیوٹ کے ایک چوک میں یہ کہہ کر اتار دیا گیا کہ دوبارہ چناب نگر کا رخ نہ کرنا۔ شیخ زبیر کے پاس اس وقت صرف تن کے کپڑے تھے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ رات کہاں گزاریں۔ اسی اثنا میں پاس سے گزرنے والے کسی مقامی آدمی نے انہیں قریب ہی واقع مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ کے مدرسے کی راہ دکھائی۔ وہ وہاں پہنچ گئے۔ اتفاقاً مولانا چنیوٹی ان دنوں چنیوٹ میں ہی قیام پذیر تھے اور اس وقت مدرسے میں موجود تھے۔ شیخ زبیر کی بپتا سننے کے بعد انہوں نے انہیں اپنے مدرسے میں ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ شیخ زبیر قریباً ڈیڑھ ماہ ان کے مدرسے میں مقیم رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دوران وہ جس بات سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے، وہ یہ تھی کہ مولانا منظور چنیوٹیؒ نے ایک بھی دن ان سے نفرت کا اظہار کیا نہ ہی انہیں قادیانیت چھوڑنے اور اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ بلکہ وہ جب بھی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے تو وہ ان کے ساتھ انتہائی شفقت سے پیش آتے۔ چونکہ شیخ زبیر پڑھے لکھے آدمی ہیں، اس لئے وہ خود گاہے بہ گاہے مولانا چنیوٹی سے قادیانیت اور اسلام کے متعلق سوالات پوچھتے رہتے اور مولانا جواب دیتے جاتے۔ شیخ زبیر کا یہ کہنا ہے کہ مولانا منظور چنیوٹیؒ کی صحبت میں گزرنے والے ان چند دنوں نے ہی ان کی کایا پلٹ دی اور وہ مسلمان ہو گئے۔ جب ان کے مسلمان ہونے کی اطلاع چناب نگر پہنچی تو جماعت نے انہیں پھر نشانے پر رکھ لیا۔ 2002ئ، 2008ء اور 2009ء میں ان کے خلاف تین جھوٹے مقدمے درج کرائے گئے، جن میں ان کی گرفتاری بھی ہوئی اور وہ مجموعی طور پر پانچ سال جیل میں بھی رہے۔ لیکن ان مظالم کے باوجود وہ ثابت قدم رہے، تاہم اب بھی وہ اپنی بیٹی کے حصول کیلئے عدالتوں میں دھکے کھا رہے ہیں۔ بچے چھیننے کے بعد باغیوں کے خلاف جو دوسرا بڑا حربہ استعمال کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر کسی کی جوان بیٹیاں شادی شدہ ہوں تو باپ کے مسلمان ہونے کی صورت میں بیٹیوں کو طلاقیں دلوا دی جاتی ہیں۔ بلاشبہ یہ کسی باپ کیلئے بہت بڑا صدمہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ قادیانی کمیونٹی کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ایسے لوگوں کا معاشی و سماجی بائیکاٹ کیا جائے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس طرح کے کئی تکلیف دہ مسائل بھی بے شمار قادیانیوں کے مسلمان ہونے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں“۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆

ummat.com.pk

قادیانی جماعت نے چناب نگر میں اپنا عدالتی نظام بنا رکھا ہے

دفتر امور عامہ تھانے کا درجہ رکھتے ہیں۔ جہاں ٹارچر سیل بنے ہوئے ہیں۔ قبول اسلام کے بعد قادیانی دشمن بنے ہوئے ہیں۔ پانچ ماہ قبل بھی مجھے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ مسلمانوں سے درخواست ہے میرے لئے استقامت کی دعا کریں۔ سابق قادیانی مربی کی کہانی

قادیانیت سے تائب ہوکر مسلمان ہونے والے محمد نذیر نے بتایا کہ ”.....چناب نگر میں جماعت احمدیہ نے ریاست کے اندر ریاست قائم کر رکھی ہے۔ وہاں ان کا اپنا پولیس اور عدلیہ کا متوازی نظام ہے۔ دفتر امور عامہ تھانے اور دفتر عمومی پولیس چوکی کا درجہ رکھتے ہیں، جہاں باقاعدہ ٹارچر سیل بنے ہوئے ہیں۔ ان کا عدالتی نظام ایسے ہی ہے، جس طرح ملک بھر میں عدالتی نظام کے چار درجے ہیں، سول کورٹ، سیشن کورٹ، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ۔ بالکل اسی طرح چناب نگر میں جماعت احمدیہ کے عدالتی نظام کے بھی چار درجے ہیں۔ قادیانی وکلا وہاں پیش ہوکر بحث میں حصہ لیتے ہیں۔ قادیانی ججز چھٹی کے روز وہاں فرائض انجام دیتے ہیں اور آخری اپیل مرزا مسرور کے پاس کی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چناب نگر میں انصاف نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ قادیانیوں کی ایک قابل ذکر تعداد ایسی ہے جو وہاں سے نکلنا چاہتی ہے لیکن ان کی معاشی و سماجی مجبوریاں آڑے آرہی ہیں۔ میں پوری ذمہ داری سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اگر آج حکومت چناب نگر کو اوپن سٹی قرار دیتے ہوئے وہاں کے مکینوں کو جائیداد کے مالکانہ حقوق اور جان و مال کا تحفظ فراہم کرے تو 25 فیصد قادیانی ابھی مسلمان ہوجائیں گے۔ جماعت احمدیہ کی قیادت کی علمی قابلیت کا یہ حال ہے کہ 1999ء میں جب میری شادی ہوئی تو میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرا نکاح مرزا مسرور پڑھائیں، جو اس وقت ابھی خلیفہ نہیں بنے تھے بلکہ ناظر اعلیٰ و امیر مقامی جماعت احمدیہ پاکستان تھے۔ میں نے جب ان کے پاس حاضر ہوکر نکاح پڑھانے کی درخواست کی تو وہ پریشان ہوگئے۔ تھوڑی دیر کچھ سوچتے رہے اور پھر بڑی سنجیدگی سے بولے، ”آپ میری انگلی پکڑو اور مجھے جامعہ احمدیہ میں داخل کرا آؤ۔ پانچ سالہ کورس مکمل کرنے کے بعد میں آپ کا نکاح پڑھانے کے قابل ہوجاؤں گا۔“

”.....رفیق جٹ کا دیا ہوا چیک ڈس آنر ہونے کے بعد جب میں چناب نگر سے نکلا تو میری بڑی بیٹی روتی ہوئی میری ٹانگوں سے چمٹ گئی اور کہنے لگی ”پاپا میں نے آپ کے ساتھ جانا ہے“۔ اس وقت مجھ پر کیا گزری، یہ درد اور کرب وہی شخص سمجھ سکتا ہے جسے اللہ نے بیٹی جیسی رحمت سے نوازا ہوا ہے۔ چناب نگر سے نکل کر لاہور آیا اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے چھوٹی موٹی مزدوری شروع کردی۔ ایسے ہی ایک روز اچانک میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر ابھی مجھے موت آجائے تو میرا جنازہ کون پڑھائے گا، کہ جماعت احمدیہ تو مجھے منہ نہیں لگائے گی کیونکہ ان کے نزدیک میں باغی ہوں۔ اور قادیانی ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو ویسے ہی مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ تو بالکل خدا ہی ملا نہ وصال صنم والی صورتحال ہوگئی تھی۔ یہ خیال میرے ذہن پر اس بری طرح سوار ہوا کہ ہر وقت یہی سوچتا رہتا کہ میرا انجام کیا ہوگا۔ 23 فروری 2014ء کو لاہور کے ایک عالم سید انیس شاہ صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ دو روز بعد 25 فروری کی شام نماز عشا کے بعد مجھے انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ کے رہنما مولانا قاری رفیق وجھوی صاحب کے پاس لے گئے۔ قاری صاحب سے ہونے والی میری یہ ملاقات چار گھنٹوں پر محیط تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ ان دنوں میں سابقہ حالات کی وجہ سے سخت خوفزدہ تھا۔ ہر وقت یہی ڈر رہتا کہ کسی بھی وقت کوئی اندھی گولی مجھے چاٹ سکتی ہے، راہ چلتے پیچھے سے آنے والی کوئی گاڑی مجھے کچل سکتی ہے۔ کسی بھی وقت میری زندگی کا چراغ گل ہوسکتا ہے۔ قاری صاحب نے سب سے پہلے تو مجھے حوصلہ دیا اور کہا کہ اگر آپ اسلام کی حقانیت پر ایمان لاچکے ہیں تو پھر آپ کو کسی سے بھی نہیں ڈرنا چاہئے کیونکہ مسلمان اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ اتفاقاً اگلے ہی روز 26 فروری کو ایوان اقبال لاہور میں ”فتح مباہلہ کانفرنس“ منعقد ہورہی تھی۔ قاری رفیق صاحب کہنے لگے کہ کل کانفرنس ہورہی ہے۔ یہ اللہ نے آپ کو موقع دیا ہے کہ آپ اس کانفرنس میں شریک ہوکر اسلام قبول کریں، آپ کے قبول اسلام کے ہزاروں لوگ گواہ ہونگے۔ لہٰذا اگلے روز میں کانفرنس میں شریک ہوا اور اللہ کے فضل و کرم سے مولانا عبدالحفیظ مکی، ڈاکٹر احمد علی سراج، مولانا الیاس چنیوٹی، جسٹس (ر) ڈاکٹر علامہ خالد محمود، سابق چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ جسٹس (ر) خواجہ شریف اور دیگر شخصیات کی موجودگی میں اردن سے آئے ہوئے اسلامی اسکالر امجد عبدالرحمٰن السقلاوی نے مجھے کلمہ پڑھایا۔ بعدازاں قاری رفیق صاحب نے مجھے باعزت طریقے سے اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونے کے لئے حوصلہ بھی دیا اور خود ہی میرا رشتہ تلاش کرکے ایک مسلمان خاتون سے میری شادی بھی کرائی۔ اس سلسلے میں، میں دینی جماعتوں خصوصاً تحفظ ختم نبوت کے لئے کام کرنے والی تنظیموں کے ذمہ داران سے بصد احترام یہ گزارش کروں گا کہ وہ قادیانیت چھوڑ کر مسلمان ہونے والوں کو سنبھالنے کے لئے کوئی ٹھوس منصوبہ تشکیل دیں۔ انہیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہوکر زندگی گزارنے میں مدد دیں۔ جماعت احمدیہ کی طرف سے دائر کئے جانے جھوٹے مقدمات سے نمٹنے کیلئے قانونی معاونت فراہم کریں۔ ان کی دلجوئی کریں۔ جبکہ یہاں صورتحال یہ ہے کہ ہمارے ساتھی شیخ زبیر جب ایک جھوٹے مقدمے میں ڈسٹرکٹ جیل جھنگ میں قید تھے تو ان کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ گھر والے پہلے ہی ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ ایک خدا ترس جیل ملازم نے جب ان کی بپتا سنی تو ان کے لئے وکیل کا بندوبست کیا، تب ان کی رہائی ممکن ہوئی۔ میرے مسلمان ہونے کے بعد بھی جماعت احمدیہ نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ 26 مئی 2014ء کی دوپہر لاہور کی لبرٹی مارکیٹ کے قریب کچھ نامعلوم موٹر سائیکل سواروں نے مجھ پر حملہ کرکے شدید تشدد کا نشانہ بنایا۔ مختلف ٹیلی فون نمبروں سے دھمکی آمیز کالیں آنے کا سلسلہ تو معمول میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ گاہے بہ گاہے ”بہترین مستقبل“ کا لالچ بھی دیا جاتا ہے جس کی تازہ ترین مثال یہ ہے کہ ابھی جب میرا انٹرویو ”امت“ میں چھپنا شروع ہوا تو چند روز قبل جماعت نے میرے بہنوئی کے ذریعے مجھ سے رابطہ کیا اور مجھے پیشکش کی گئی کہ اگر میں واپس لوٹ آؤں اور یہ بیان دے دوں کہ ”امت“ میں چھپنے والا میرا انٹرویو خودساختہ ہے اور میرا اس سے کوئی تعلق نہیں، تو جماعت نہ صرف مجھے مالی وسائل فراہم کرے گی بلکہ مجھے اپنی سابقہ بیوی اور بیٹیوں کے ہمراہ بیرون ملک سیٹل بھی کرائے گی۔ لیکن میں ”امت“ کے توسط سے جماعت احمدیہ کی قیادت کو یہ چیلنج کرتا ہوں کہ میں نے اس انٹرویو میں جو کچھ بیان کیا ہے، وہ میری کہی ہوئی کسی ایک بات پر مجھے جھوٹا ثابت کردیں۔ میرا یہ چیلنج مرزا مسرور سے سلیم الدین تک، سب کیلئے ہے۔ وہ کھلے میدان میں آئیں، میرے ساتھ مباہلہ کریں اور مجھے جھوٹا ثابت کریں۔ مجھے بخوبی علم ہے کہ جماعت احمدیہ میرے بارے میں کوئی نیک جذبات نہیں رکھتی۔ میرے ساتھ کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اس لئے میں ”امت“ کے توسط سے یہ بات ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ اگر میرے ساتھ کوئی حادثہ ہوا یا مجھے کوئی نقصان پہنچا تو اس کے ذمہ دار مرزا مسرور، ناظر اعلیٰ مرزا خورشید، ناظر امور عامہ سلیم الدین، اللہ بخش صادق اور دیگر مرکزی ذمہ داران ہونگے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر میرے ساتھ کوئی حادثہ ہوا تو میرے سرپرست قاری رفیق صاحب ہیں، وہی میرا مقدمہ لڑیں گے۔ ان کے علاوہ میرا کوئی سرپرست نہیں ہے۔ میں جب یہ سوچتا ہوں کہ میں نے سیکڑوں مسلمانوں کو اسلام سے کفر کی طرف دھکیلا تو طبیعت بہت بے چین ہوجاتی ہے لیکن میں اپنے رب کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔ میرا عزم ہے کہ میں بہت جلد ان تمام علاقوں کا دورہ کروں گا، جہاں بطور مربی کام کرتا رہا اور وہاں لوگوں کو یہ بتاؤں گا کہ حضور ﷺ کے بعد اللہ نے نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کردیا۔ اب جو بھی نبوت کا دعویدار سامنے آئے گا وہ کذاب کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہوسکتا اور مرزا غلام احمد قادیانی بھی ان میں سے ایک ہے۔ میری تمام مسلمانوں سے درخواست ہے کہ وہ میرے لئے دعا کریں کہ اللہ مجھے استقامت دے اور جلد از جلد حرمین شریفین کی زیارت نصیب فرمائے تاکہ میں بیت اللہ شریف اور روضہ رسول ﷺ پر حاضر ہوکر اپنے گناہوں کی معافی مانگ سکوں۔“

☆☆☆☆☆

urmat.com.pk